عکس و شخص ۔ از جناب عنوان چشتی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۴۸ مع گردپوش، قیمت صر پتے: مکتبہ عاجض ۳۸۳ مادی پور دہلی۔ (۲) مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

یہ جناب عنوان چشتی لکچرار اردو جامعہ ملیہ دہلی کے مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں دس اصحاب شعر و ادب کا سراپا اور ان کی شخصیت کے نمایاں خد و خال اجاگر کئے گئے ہیں، اور ان کے ادبی و فنی کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے، دو مضامین کے علاوہ جن میں پروفیسر مجیب کی ڈرامہ نگاری اور کوثر چاند پوری کی کتاب "جہانِ غالب" پر نقد و تبصرہ ہے، باقی مضامین میں غلام ربانی تاباں، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ابو احسن گنوری، شفا گوالیاری، مسکش اکبر آبادی، تسکین قریشی، انور صابری اور نریش کمار شاد کی شاعری کی خصوصیات پر دلچسپ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے، اس حیثیت سے مصنف کی یہ کوشش قابلِ ستائش ہے کہ انھوں نے بعض ایسے شعراء کا انتخاب کیا ہے جنکو عموماً نظر انداز کر دیا گیا ہے، یا جنکی جانب بہت کم توجہ کی گئی ہے، بعض مضامین میں عقیدت کا رنگ غالب ہو گیا ہے، اور سراپا بیان کرنے میں غیر ضروری تشبیہ و استعارہ سے کام لیا گیا ہے، تاہم یہ مجموعہ دلچسپ اور مصنف کے خیالات متوازن اور تبصرے ناقدانہ ہیں۔

کاروان مدینہ ۔ از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۳۰ قیمت ے ر پتہ: مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ۔

یہ مجموعہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے دس مضامین اور خطبوں پر مشتمل ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت اور آپ کے پیغام پر عمل کی نہایت دردمندانہ اور پرسوز انداز میں دعوت دی گئی ہے، اس سلسلہ میں رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آپ کی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں اور نبوت کے عظیم الشان کارناموں، عطیات و احسانات اور اس کے عالمگیر نتائج و اثرات کا ذکر بھی کیا گیا ہے، اکثر مضامین مصنف کی عربی تقریروں کا اردو ترجمہ ہیں جو عرب نیشنلزم کی تحریک کے جواب میں کی گئی ہیں، ان میں دنیا کی موجودہ بے اطمینانی، مادیت اور خدا فراموشی کی لائی ہوئی تباہی اور ہلاکت کا علاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات و تعلیمات کو تجویز کیا گیا ہے، آخر کے دو مضامین میں اردو و فارسی شعرا کے نعتیہ کلام کی مصنف نے اپنے شگفتہ اور موثر انداز میں تشریح کی ہے۔

ض

جلد ۱۰۴ ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۶۹ء عدد ۶

مضامین

شذرات

پاکستان کے بعض غیر ذمہ دار ناشروں نے دارالمصنفین کی بہت سی مطبوعات چھاپ لی ہیں، جس سے اُن کو کچھ ذاتی فوائد تو ضرور حاصل ہو رہے ہوں گے لیکن اس علمی ادارہ کو بہت مالی نقصان پہنچ رہا ہے، مگر خوشی ہے کہ پاکستان میں اُس کے بہت سے مخلص قدردانوں نے اُس کی مطبوعات کے دست برد کے خلاف احتجاج بھی کیا ہے، ان میں سب سے نمایاں نام جناب سید حسام الدین راشدی صاحب کا ہے، جن کو پاکستان میں اپنی اعلیٰ علمی قابلیت کے ساتھ اپنی باوقار اور دلنواز شخصیت کی وجہ سے بڑی عزت اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے، انھوں نے پاکستان کے اہم روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات میں دارالمصنفین کے ساتھ اس بدسلوکی کی طرف وہاں کے لوگوں کی توجہ دلائی، اُن کی ہم نوائی جناب ممتاز حسن صاحب سابق سکریٹری محکمہ خزانہ حکومت پاکستان، جناب جمیل الدین عالی صاحب معتمد انجمن ترقی اردو پاکستان و رائٹرز گلڈ، جناب ابن انشا ڈائرکٹر نیشنل بک سنٹر آف پاکستان، جناب حامد علی خاں صاحب مونس مطبوعات فرینکلن اور جنگ، امروز، نوائے وقت، حریت، مشرق اور کتاب کے ایڈیٹروں نے کی، جناب فضل اقبال صاحب (سابق ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان نئی دہلی) نے بھی دارالمصنفین کے ساتھ اس بے انصافی کی طرف اپنی حکومت کو توجہ دلائی،

اس پرزور احتجاج کے بعد حکومت پاکستان کی طرف سے ایک آرڈیننس بھی جاری ہوا ہے جس میں اعلان کیا گیا ہے کہ پاکستان کا کوئی ناشر حکومت کی اجازت کے بغیر کسی غیر ملکی مصنف کی کوئی کتاب شائع نہیں کر سکتا، اس سے وقتی طور پر بعض ناشروں کی غلط قسم کی سرگرمیوں کی روک تھام تو ضرور ہو گئی ہے، پھر بھی ضرورت تھی کہ

دارالمصنفین کی مطبوعات کی مستقل نگہداشت کے لئے کوئی مؤثر کارروائی کی جائے، یہ خاکسار گذشتہ دو مہینے پاکستان میں رہا تو اس سلسلہ میں جناب سید حسام الدین راشدی صاحب کے حسن وساطت اور اخلاص سے بہت سی مفید باتیں انجام پا گئیں، جن کے لئے دارالمصنفین ان کا مزید شکر گذار ہے،

سید حسام الدین راشدی صاحب نے اپنے دولت کدہ پر ایک پر تکلف ڈنر میں کراچی کے ممتاز اہل علم و دیگر اکابر کو مدعو کیا، جن میں سے کچھ کے اسمائے گرامی یہ ہیں، جناب ممتاز حسن صاحب سابق سکریٹری محکمہ خزانہ حکومت پاکستان، جناب جمیل الدین عالی صاحب معتمد رائٹرز گلڈ، انجمن ترقی اردو، ڈاکٹر معین الحق سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، جناب شان الحق حقی صاحب ڈائرکٹر اردو ترقی بورڈ، جناب الطاف بریلوی صاحب سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ابن انشا صاحب ڈائرکٹر نیشنل بک سنٹر آف پاکستان، حکیم سعید احمد صاحب مالک ہمدرد دواخانہ، ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی بانی انجمن الفلاح، جناب ابن الحسن صاحب چیف پبلک نزا افیسر، جناب مشفق خواجہ صاحب انجمن ترقی اردو، جناب یسین خاں صاحب ڈائرکٹر کاپی رائٹ، پروفیسر ریاض الاسلام شعبۂ تاریخ کراچی یونیورسٹی، جناب ایوب قادری صاحب لکچرر اردو کالج، جناب اعجاز الحق قدوسی صاحب مصنف صوفیائے سندھ و پنجاب، جناب رازق الخیری صاحب ایڈیٹر عصمت، ان کے علاوہ اخبارات کے کچھ نمایندے اور ناشرین کتب بھی تھے، جناب سید حسام الدین صاحب نے دارالمصنفین کی خدمات پر ایک پرمغز تقریر کی، اُن کے بعد خاکسار نے حاضرین کی توجہ دارالمصنفین کی اُن مشکلات کی طرف دلائی جو پاکستان کے بعض ناشرین کے اس کی مطبوعات کے چھاپ لینے کے بعد پیدا ہو گئی ہیں، تمام حاضرین نے اس ادارہ سے اپنی پوری ہمدردی کا اظہار کیا، اور اُس کی مطبوعات کی نگہداشت کی تجویزیں بھی پیش کیں، مباحثہ میں جناب ممتاز حسن، جمیل الدین عالی صاحب، ابن انشا اور الطاف حسین بریلوی صاحبان نے خاص طور پر حصہ لیا،

ایک دوسری نشست میں یہ طے پایا کہ دارالمصنفین سے باضابطہ اختیارات لیکر ایسے ناشرین کے خلاف آئندہ قانونی کارروائی کی جائے، جو اُس کی مطبوعات چھاپ کر اُس کو نقصان پہنچاتے ہیں، راقم نے دارالمصنفین کی طرف سے ایسے اختیارات جناب ابن الحسن صاحب کو تفویض کئے ہیں، جو جناب ظہور الحسن صاحب سابق رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنفین کے صاحبزادے ہیں، اُن کو دارالمصنفین کی علمی سرگرمیوں سے بڑی دلچسپی ہے، امید ہے کہ اُن کی توجہ سے دارالمصنفین کی مطبوعات کی دست برد رک جائے گی اس کی ساری علمی خدمات زیادہ تر اس کی مطبوعات کی آمدنی سے انجام پاتی ہیں اگر پاکستان کے ناشرین اسی طرح اس کی کتابیں چھاپ کر اس کو نقصان پہونچاتے رہے تو علوم و فنون کی خدمت کرنے والا یہ پرانا ادارہ موت کے منھ میں آجائے گا،

معارف کے ناظرین کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ پاکستان کے کچھ ممتاز اہل علم نے شبلی و سلیمان یادگار سوسائٹی قائم کی ہے، جس کا مقصد مولانا شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تحقیقی اور علمی سرگرمیوں کو فروغ دینا ہے، اس کے صدر جناب ممتاز حسن، سکریٹری جناب ابن الحسن، خازن جناب جمیل الدین عالی، اور ارکین سید حسام الدین راشدی، مولانا عبدالوہاب جمال الدین، حمید احمد، حکیم سعید احمد، حبیب احمد صدیقی اور ظہور الحسن صاحبان ہیں، ہم اس سوسائٹی کی تاسیس کا خیر مقدم کرتے ہیں، ہندوستان و پاکستان کے سیاسی تعلقات اس وقت خوشگوار نہیں ہیں لیکن آئندہ جب خوشگوار رہوں گے اور ہونے چاہئیں تو پھر ہم ثقافتی طور پر اس سوسائٹی سے امید رکھیں گے کہ اس کے ذریعہ سے شبلی و سلیمان کا جو ادارہ ہندوستان میں قائم ہے اس کی مطبوعات کے حقوق کی نگہبانی پاکستان میں ہوتی رہے اور پاکستان کے غیر ذمہ دار ناشر اُن کو چھاپ کر اس ادارہ کو مالی پریشانیوں میں مبتلا نہ کریں، یہ دارالمصنفین کے ساتھ شبلی و سلیمان کی بھی بہت بڑی خدمت ہوگی، پاکستان کے سفر میں بہت سے ارباب علم سے ملنے کا اتفاق ہوا اس کا ذکر انشاء اللہ آئندہ ایک مضمون میں ہوگا،

مقالات

معالم السنن امام خطابی

از

مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دارالمصنفین

حدیثوں کی جمع و تدوین کی طرح اُن کی فہم و معرفت کے لئے شرح و توجیہ بھی حدیث کی اہم اور ضروری خدمت ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:۔

دامر ثانی یعنی احتیاط در فہم معانی حدیث (عجالہ نافعہ)

اور دوسری چیز یعنی حدیث کے مفہوم کو سمجھنے میں احتیاط ضروری ہے،

اس لئے محدثین کی ایک جماعت نے اس کی جانب بھی توجہ کی، چنانچہ امام ابو سلیمان البستی خطابی کا شمار جو چوتھی صدی ہجری کے مشاہیر محدثین میں ہیں، بلند پایہ اور مستند شارحین حدیث میں ہوتا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں:۔

"حدیثوں کی شرح و توجیہ میں رطب و یابس ہر قسم کی باتیں تحریر کی گئی ہیں، اس لئے ان علماء سے واقفیت ضروری ہے، جو اس باب میں قابل اعتماد ہیں، تاکہ اُن کی تصنیفات سے پورا فائدہ اٹھایا جاسکے، علمائے شافعیہ میں امام نووی، علامہ بغوی اور ابو سلیمان خطابی نہایت قابل اعتماد ہیں، اُن کے اقوال محکم اور بحثیں بڑی پرمغز ہوتی ہیں،

امام خطابی کی متعدد تصنیفات یادگار ہیں، ان میں اعلام السنن اور معالم السنن جو شروح حدیث میں ہیں، زیادہ مشہور ہیں، پہلی کتاب میں صحیح بخاری کی، اور دوسری میں صحاح ستہ کی اہم ترین کتاب سنن ابی داؤد کی حدیثوں کی شرح اور اُن کے مشکلات حل کیے گئے ہیں، اعلام السنن غالباً نایاب ہے لیکن معالم السنن کی چار جلدیں اعلام النبلاء کے فاضل مصنف محمد راغب طباخ نے چند مخطوطہ نسخوں کی مدد سے ایڈٹ کرکے مطبعہ علمیہ حلب سے ۱۳۵۱ھ و ۱۳۵۲ھ میں شائع کی ہیں، اس کے شروع میں انھوں نے امام ابوداؤد اور امام خطابی کے حالات و کمالات بھی تحریر کیے ہیں، یہ چاروں جلدیں تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل ہیں :-

امام خطابی کی تصنیفات میں معالم السنن سب سے زیادہ اہم اور مشہور ہے، اس مضمون میں اس کے خصوصیات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے،

اکثر علماے فن کے نزدیک امام ابوداؤد کو جملہ محدثین میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے سنن واحکام کی حدیثوں کا مجموعہ مرتب کیا، اُن سے پہلے مسانید اور جوامع وغیرہ مرتب کرنے کا رواج تھا معالم السنن سنن واحکام کے اسی اولین مجموعہ اور صحاح ستہ کی ممتاز ترین کتاب کی غالباً سب سے قدیم اور سب سے اہم اور مستند شرح ہے، سنن ابی داؤد کی اس سے زیادہ قدیم کسی شرح کا ذکر نہیں ملتا، بعد میں متعدد شرحیں لکھی گئیں لیکن وہ سب زیادہ تر اس سے ماخوذ و منقول ہیں، والفضل للمتقدم،

امام ابوداؤد نے ایمانیات وعقائد کے بجائے صرف احکام و مسائل کی حدیثیں جمع کی ہیں، اس لئے امام خطابی نے بھی فقہیات کی تخریج اور احکام و مسائل کے استنباط کی جانب زیادہ توجہ کی ہے، علامہ شرف الدین طیبی فرماتے ہیں :-

واما فقه الحديث فهو ما تضمنه	فقہ حدیث سے وہ احکام وآداب

من الاحكام والآداب المستنبطة	مراد ہیں، جن پر حدیث مشتمل ہوتی ہے،
منه هذا آداب الفقهاء	اور جو اس سے مستنبط کئے جاتے ہیں،
الاعلام كالائمة الاربعة	یہی نامور فقہا، جیسے ائمہ اربعہ وغیرہ
رضي الله عنهم وفي هذا	کا طریقہ ہے، اور اس فن میں بہت
الفن مُصنفات كثيرة كمعالم	سی کتابیں لکھی گئی ہیں، جیسے امام
السنن للخطابي والتمهيد لابن	خطابی کی معالم السنن اور ابن عبدالبر
عبد البر،	کی تمہید،

(مقدمہ ناشر معالم السنن ج ۱ ص)

صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں :-

"بعض مصنفین نے دقیق وغریب الفاظ اور مشکل معانی پر مشتمل حدیثوں کا استخراج کرکے اُن کو ایک مستقل کتاب میں جمع کیا ہے، ان لوگوں نے صرف حدیثوں کا متن نقل کیا ہے، اور ان کے اعراب، غریب الفاظ اور مشکل معانی کی تشریح کی ہے جیسے ابو عبید قاسم بن سلام اور ابن قتیبہ وغیرہ[1] اور بعض مصنفین نے اس پر فقہائے آراء اور احکام و مسائل کا بھی اضافہ کیا ہے جیسا کہ معالم السنن اور اعلام السنن میں امام خطابی نے کیا ہے، ان کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی اس قسم کی کتابیں لکھی ہیں"

(کشف الظنون ج ۱ ص)

امام خطابی کے زمانہ میں فقہاء و محدثین دو گروہوں میں منقسم تھے، انھوں نے اس کتاب کو فقہ و حدیث دونوں کی جامع بناکر ان دونوں طبقوں کی تفریق ختم کرکے اُن کو ایک دوسرے

---

[1] غریب الحدیث میں امام خطابی کی بھی ایک مستقل تصنیف ہے،

کے قریب لانے کی کوشش کی، کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔

"ہمارے زمانہ کے علماء دو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں، ایک اصحاب اثر و حدیث کا اور دوسرا اہل فقہ و نظر کا طبقہ ہے، ان دونوں طبقوں کو اس طرح ہونا چاہئے تھا کہ ان میں امتیاز کرنا مشکل ہوجاتا، کیونکہ یہ دونوں درحقیقت ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں، ان میں سے کوئی جماعت بھی دوسری جماعت سے بے نیاز ہو کر اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکتی، کیونکہ حدیث کی حیثیت بنیاد اور اصل کی ہے، اور فقہ دراصل اس کی دیوار اور فرع ہے، تم خود غور کرو کہ جو عمارت کسی بنیاد اور اساس پر تعمیر نہ کی گئی ہو، اس کو ڈھ جانے سے کون بچا سکتا ہے، اسی طرح جس بنیاد پر کوئی عمارت ہی تعمیر نہ کی گئی ہو اس میں اور ویرانہ میں کیا فرق ہوسکتا ہے،

لیکن ان دونوں جماعتوں کو جن میں اتنی زیادہ وجہ قربت اور نقطۂ اتحاد پایا جاتا ہے اور جن میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے انتہائی ضروری ہے، آج وہ الگ تھلگ، اور راہ حق میں ایک دوسرے کی معاونت سے بالکل دست کش ہوگئی ہیں"،

پھر ان دونوں جماعتوں کی باہمی کشمکش اور افسوسناک طرز عمل کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"مجھے امید ہے کہ میں نے اس کتاب میں جو کچھ ثابت کیا ہے یعنی حدیث کے معانی اور اس سے مستنبط ہونے والے فقہی اصول و طرق ان پر جب فقیہ غور کرے گا تو وہ حدیث کی طلب اور علوم حدیث کی جستجو اور تتبع کے لئے آمادہ ہوگا، اور صاحب حدیث کو فقہ سے رغبت ہوگی، اور وہ اس کی تحصیل میں جد و جہد کرے گا"

(مقدمہ خطابی معالم السنن ج اول ص ۳ تا ۶)

فقہ اور احکام کے علاوہ اس میں سنن ابی داؤد کے تمام ضروری اور مشکل مسائل پر بحث کی گئی ہے

اور وہ گوناگوں فوائد، مختلف النوع مباحث اور حدیث سے متعلق اہم تحقیقات پر مشتمل بڑی جامع اور مدلل شرح ہے، امام خطابی کا خود بیان ہے کہ انھوں نے اس میں اپنے بعض دوستوں اور شاگردوں کی فرمایش پر اُن کے لئے سنن کی حدیثوں کی تفسیر، اُن کے مواقع استنباط، وجوہ معانی کی دلالت مشکل الفاظ اور دقیق متون کی شرح اور فقہی مباحث اور علماء کے اقوال و اختلافات کی تشریح کی ہے، چنانچہ علامہ محمد بن حسن صنعانی لاہوری (م ۶۵۰ھ) کا بیان ہے کہ "خطابی نے اس میں سب کچھ جمع کر دیا ہے" (فوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ ص)

اگر کسی باب کی متعدد حدیثوں کا مآل و منشا یکساں ہے تو اس کی صرف ایک ہی حدیث کی شرح پر اکتفا کیا گیا ہے، جو گویا پورے باب کی شرح ہے، لیکن اگر کسی باب کی حدیثوں سے جدا جدا مسائل اور مختلف نتائج مترتب ہوتے ہیں تو ان سب کی الگ الگ تشریح و توضیح کی گئی ہے

اس شرح کی صحیح نوعیت اور مصنف کے طریقۂ بحث اور احادیث کی تشریح و تفسیر کا اندازہ کرنے کے لئے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اذا قام احدکم من اللیل — جب تم میں سے کوئی شخص رات میں
فلا یغمسن یدہ فی الاناء — سو کر اٹھے تو وہ اپنے ہاتھوں کو تین
حتی یغسلها ثلاث مرات — دفعہ دھوئے بغیر برتن میں نہ ڈالے،
فانه لا یدری این باتت — کیونکہ اس کو پتہ نہیں کہ رات میں
یدہ، — اس کے ہاتھ کہاں تھے؟

امام خطابی اس کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"داؤد (ظاہری) اور محمد بن جریر (طبری) نے مطلقاً پانی میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کو دھونا ضروری قرار دیا ہے، ان دونوں بزرگوں کا خیال ہے کہ اگر ہاتھ نہ دھویا گیا تو پانی نجس ہو جائیگا، مگر امام احمد نے صرف رات میں سونے کے بعد ہاتھ دھونا ضروری قرار دیا ہے، کیونکہ حدیث میں رات ہی کا ذکر ہے، دوسرے عموماً لوگ دن میں سونے کے لئے کپڑے نہیں اتارتے، بلکہ رات میں اُتار کر سوتے ہیں، سونے میں ہاتھ بدن کے مختلف حصوں بلکہ ان جگہوں پر بھی پہنچ جاتا ہے، جہاں کلوخ سے استنجا لینے کی وجہ سے ممکن ہے، مکمل صفائی نہ ہوئی ہو، اور نجاست کے اثرات باقی رہ گئے ہوں، ایسی صورت میں ہاتھ دھوئے بغیر اگر پانی کے اندر ڈال دیا گیا، تو نجاست لگ جانے کی وجہ سے پانی خراب ہو جائے گا، لیکن اگر ہاتھ اور مخصوص جگہ کے درمیان کپڑا حائل ہو تو اس قسم کا کوئی خدشہ نہیں رہ جاتا'

مگر عام علماء کے نزدیک اگر دھوئے بغیر بھی ہاتھ پانی میں ڈبو دیا جائے تو پانی پاک رہے گا، الا آنکہ ہاتھ میں نجاست لگے ہونے کا یقین ہو کیونکہ حدیث میں (لایدری این باتت یدہ) کہکر اس کو شک وارتیاب سے متعلق کر دیا گیا ہے اور جس امر میں شک واحتمال ہو جائے، وہ واجب نہیں ہو سکتا، پانی کی اصل طہارت ہے، یہی حال انسان کے جسم کا بھی ہے، اور جب طہارت یقینی طور پر ثابت ہو گئی تو اس قسم کے شبہات اور احتمالات سے وہ زائل نہیں ہو سکتی"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑے پانی میں اگر نجاست شامل ہو گئی تو چاہے وہ کم ہی کیوں نہ ہو پانی کا حکم بدل جائے گا، کیونکہ جو نجاست ہاتھ میں اس طرح لگی ہو کہ دکھائی بھی نہ دے تو وہ یقیناً کم ہی ہوگی،

اس حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر نجاست کے اوپر تھوڑا پانی بھی اس طرح ڈالا جائے کہ وہ اس پر غالب ہو جائے تو نجاست زائل ہو جائے گی، اور وہ خود نجس نہ ہوگا، کیونکہ برتن کے جس پانی کو آپ نے گرانے کا حکم دیا ہے وہ برتن میں باقی رہنے والے پانی سے بھی کم ہے، مگر آپ نے اس کم کی بھی طہارت ہی کا نہیں بلکہ مطہر ہونے کا بھی حکم صادر فرمایا ہے، اور اس کے مقابلہ میں اس سے زیادہ پانی کو نجس قرار دیا ہے، جس میں نجاست لگا ہوا ہاتھ ڈالدیا گیا ہو، اس سے وارد (نجاست پر ڈالے جانے والے) اور مورود (جس پانی میں نجاست پڑ جائے) کا فرق صاف ظاہر ہوتا ہے؛

حدیث میں یہ دلیل بھی موجود ہے، کہ نجاست کو سات دفعہ دھونے کا جو حکم بعض حدیثوں میں دیا گیا ہے، وہ صرف بعض ہی نجاستوں کے ساتھ مخصوص ہے، ہر نجاست کیلئے یہ تعداد ضروری نہیں ہے، بلکہ سات دفعہ سے کم تعداد بھی نجاست کو زائل کرنے کے لئے کافی ہے، اس حدیث میں تین دفعہ دھونے کا ذکر احتیاطاً اور نجاست کے یقینی طور سے زائل ہو جانے کے لئے دیا گیا ہے، کیونکہ عموماً متواتر تین بار دھو لینے سے نجاست زائل ہو جاتی ہے، اس مسئلہ میں نجاست چونکہ غیر مرئی ہے اس لئے تین دفعہ دھونے کی صراحت کی گئی ہے تاکہ نجاست کے زائل ہو جانے کا یقین ہو جائے ورنہ اگر وہ مرئی ہوتی تو ایک دفعہ دھو لینا بھی بشرطیکہ وہ زائل ہو جائے کافی تھی،

اس حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ مقام استنجاء میں اگر نجاست کا اثر باقی رہ گیا ہو تو اس حالت میں بھی نماز کے جواز کے لئے رخصت ہے، لیکن اس پر مزید چیزوں کو قیاس کرنا درست نہیں ہے،

حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادات کے معاملہ میں احتیاط اور اطمینان کا طریقہ اختیار کرنا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے،[1]

---

[1] معالم السنن ج اول ص ۴۷ و ۴۸،

ایک اور مثال ملاحظہ ہو، اس سے اندازہ ہوگا کہ مسائل کے تجزیہ و تنقیح اور دقتِ نظر اور حدیث کی فہم و معرفت میں اُن کو کتنا کمال حاصل ہے،

ایک مرتبہ حضرت قبیصہؓ صحابی جنھوں نے کوئی ذمہ داری لے لی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ تم رُکے رہو تاکہ اگر ہمارے پاس صدقہ کی کوئی رقم آئے تو تم کو دیدی جائے، پھر فرمایا،

یا قبیصة إنّ المسئلة لا تحل	اے قبیصہ تین ہی آدمیوں کے لئے سوال
الا لاحد ثلاثة رجل تحمل	کرنا جائز ہے ایک وہ آدمی جس نے کوئی
بحمالة فحلت له المسئلة	ذمہ داری سنبھالی ہو تو اس کے لئے
فسأل حتى يصيبها ثم يمسك	سوال کرنا جائز ہے، پس ایسا شخص
ورجل اصابته جائحة فاجتاحت	جب سوال کرے تو اس کو صدقہ دیا
ماله فحلت له المسئالة	جائے، تاکہ وہ سوال سے رُک جائے
فسئال حتى يصيب قواماً	اور دوسرا وہ آدمی ہے جس کو کوئی آفت
من عيش او قال سداداً من	پیش آگئی تو اُس کے لئے مانگنا حلال ہو گیا،
عيش ورجل اصابته فاقة	پس وہ سوال کرے گا تاکہ اس کی حالت
حتى يقول ثلاثة من ذوى	بہتر ہو جائے، اور تیسرا وہ شخص ہے جسکو
الحجى من قومه قد اصابت	فوری ضرورت اور احتیاج لاحق ہو گئی
فلاناً الفاقة فحلت له المسئالة	تو اس کے لئے بھی سوال کرنا جائز ہے،
فسئال حتى يصيب قواماً من	اور یہ بھی اپنی حالت سدھارنے کے لئے
عيش او قال سداداً من	سوال کرے گا تاکہ اس کی حالت بہتر

عيش ثم يمسك وما سواهن	ہو جائے اور تیسرا وہ شخص ہے جس کو فوری
من المسألة يا قبيصة سحت	ضرورت اور احتیاج لاحق ہوگئی تو اس
ياكلها صاحبها سحتاً،	کے لئے بھی سوال کرنا جائز ہے، اور
	یہ بھی اپنی حالت سدھارنے کے لئے سوال
	کرے گا، اور جب حالت سنبھل جائے
	تو سوال سے رُک جائے، اے قبیصہ!
	ان تینوں صورتوں کے سوا ہر سوال
	باطل ہے، اور اُس کو کھانے والا حرام

اُس کی تشریح میں امام موصوف لکھتے ہیں:-

"یہ حدیث گوناگوں فوائد و معلومات اور علم و حکمت کے دفاتر پر مشتمل ہے، اس میں رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان لوگوں کی تین قسمیں بتائی ہیں، جن کے لئے سوال کرنا جائز ہے، ایک قسم اغنیا کی اور دو قسمیں فقراء کی ہیں، فقر کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں، فقر ظاہر اور فقر باطن،

جس غنی کے لئے مانگنا حلال ہے، اس کو صاحب الحمالۃ یعنی کسی ذمہ داری کا کفیل اور اہم معاملہ کا بوجھ اٹھانے والا کہا گیا ہے، مثلاً کسی قوم کے درمیان اختلاف واقع ہو جائے اور اُن کی عداوت و دشمنی اتنی سخت ہو جائے کہ قتل و خونریزی یا اور کسی نہایت شدید قسم کے فتنہ کا اندیشہ پیدا ہو جائے، اس نازک مرحلہ پر اگر کوئی شخص درمیان میں پڑ کر اختلاف رفع کرنے اور اصلاح ذات البین کی کوشش کرے، اور اُس کو فتنہ فرو، اور فریقین کو رضامند کرنے کے لئے کثیر مصارف برداشت کرنا پڑے، یا کسی خطیر سرمایہ کا ضامن

ہونا پڑے تو چونکہ اُس نے ایک اچھے اور بھلے کام یعنی اصلاح ذات البین کی کوشش کی ہے اس لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اس کے لئے خود زیر بار ہو، بلکہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں اُس کی امداد و اعانت کی جائے گی، اور صدقہ و خیرات میں سے بھی اس کو اس قدر رقم دی جا سکتی ہے، جس سے اس کی زیر باری ختم ہو اور وہ اپنی ضمانت سے عہدہ برآ ہو جائے،

اہلِ حاجت کی پہلی قسم میں وہ آدمی شامل ہے جو جائحہ کا شکار ہو گیا ہو، جائحہ کا اطلاق عام طور سے ناگہانی آفت پر کیا جاتا ہے، جیسے سیلاب میں کسی کا مال و اسباب بہہ جائے، یا آگ میں جل جائے، یا ژالہ باری سے کھیتی اور باغ کے پھل تباہ ہو جائیں یہ سب ایسی صورتیں ہیں، جن کے اثرات پوشیدہ نہیں رہتے، بلکہ عام لوگوں کو اس کا علم ہو جاتا ہے، اس قسم کی افتاد سے اگر کسی کا مال برباد ہو گیا ہو، تو اس کے لئے بھی سوال کرنا جائز ہے، اور لوگوں کو اس کے فقر کا ثبوت اور مستحق صدقہ ہونے کا ثبوت کئے بغیر اس کو صدقہ دینا ضروری ہے،

تیسرا آدمی وہ ہے جو بظاہر خوش حال اور صاحبِ حیثیت ہو لیکن اگر وہ یہ دعویٰ کرے کہ چوروں اور رہزنوں نے اُس کا مال لوٹ لیا، یا ان لوگوں نے خیانت کی ہے، جن کے پاس اُس نے اپنا مال امانت رکھا تھا، یہ ایسی شکلیں ہیں کہ جن کا عموماً لوگوں کو علم نہیں ہوتا اور نہ آثار و قرائن سے اُن کا پتہ چلتا ہے، اس لئے جب کسی شخص کو اس قسم کا واقعہ پیش آئے اور لوگوں کے دلوں میں اس کے بارہ میں شبہات ہوں، تو اُن کو اُن لوگوں سے جن کو اس سے خصوصیت و قربت حاصل ہو، اور جو اُس کے حالات کے متعلق واقفیت رکھتے ہوں، دریافت کرنا چاہئے، حالات کی تحقیق اور تفتیش کئے بغیر اُس کو صدقہ نہیں

دینا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ مبارک (حتی یقول ثلاثۃ من ذوی الحجا من قومہ قد اصابت فلاناً الفاقۃ) کا یہی مطلب ہے، آپ نے حجیٰ (عقل) کی شرط اسی لئے لگائی ہے کہ اس کے حالات بالکل محقق اور ثابت ہو جائیں یعنی یہ لوگ، ایسے غبی، بلید اور بے خبر نہ ہوں، جن سے اندرونی معاملات اور داخلی حقائق مخفی رہتے ہوں، یہ معاملہ تبیین و تحقیق کی نوعیت کا ہے، اُس کو شہادت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ شہادت میں تین کی تعداد شرط نہیں ہے، اس قسم کے معاملہ میں اگر اس کی قوم یا قرب و جوار کے لوگوں اور اُس کے حالات سے واقفیت رکھنے والوں نے اُس کے دعویٰ کی تصدیق کر دی تو اُس کو صدقہ دیا جائے گا،

اس روایت سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اگر کسی شخص کے ذمہ کوئی حق اور مطالبہ عائد ہو رہا ہو، اور اس کو قاضی کے سامنے لایا گیا، وہ اپنے افلاس کا دعویٰ کرے تو اُس کے معاملہ میں غور کرنا ضروری ہے، اگر اُس کے ذمہ کوئی ایسا حق ثابت ہو جو موجبِ تملیک ہو، جیسے مطالبہ کرنے والے نے قرضہ دیا ہو یا کوئی چیز فروخت کی ہو، تو چونکہ اس کا ان چیزوں پر قبضہ ثابت ہو چکا ہے، اس لئے اس کو قید کر دیا جائے گا، اور افلاس کے متعلق اُس کی کوئی بات نہیں سُنی جائے گی، کیونکہ قبضہ اور ملکیت ثابت ہونے کے بعد وہ بظاہر مفلس اور تنگ دست نہیں رہا، لیکن اگر قید کے بعد اس کے افلاس کا کوئی ثبوت مل جائے، تو رہا کر دیا جائے گا، لیکن اگر اُس کے ذمہ عورت کی مہر، جنایت یا اور کسی قسم کے تاوان وغیرہ کی نوعیت کا حق عائد ہو تو چونکہ ان صورتوں میں قبضہ اور تملیک کا سوال پیدا نہیں ہوتا، اس لئے اس کو قید نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کے معاملہ میں غور کیا جائے گا، اگر وہ صاحبِ ملکیت ہے تو اُس کے ذریعہ مطالبہ ادا کیا

جائے گا، ورنہ وسعت و کشادگی کے وقت تک کے لئے مہلت دی جائے گی،

یہ واضح رہنا چاہئے کہ لوگوں کی اصل حالت فقر و افلاس کی ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب آدمی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو اس کے جسم پر کچھ بھی نہیں ہوتا، پھر اللہ اس کو روزی اور غنی بخشتا ہے" آپ سے یہ بھی روایت ہے کہ غنی کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے" اور مالدار آدمی اگر ادائیگی قرض سے انکار کرے یا اس میں تاخیر کرے تو اس کی عزت و آبرو مباح اور اس کو سزا دینا جائز ہو جاتا ہے" ظاہر ہے جب آپ نے آسائش اور غنیٰ کی موجودگی میں انکار یا تاخیر کرنے والے کو ظالم قرار دیا ہے تو اس شخص شخص کو کس طرح قید کر سکتے اور سزا دے سکتے ہیں، جب کہ یہ ظالم نہیں ہے،

آپ کا حضرت قبیصہ کو صدقہ دینے کے لئے روکنا اس بات کی دلیل ہے، کہ صدقہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کیا جا سکتا ہے، حدیث میں صدقہ کی حد کفایت بتائی گئی ہے، یعنی اتنا صدقہ دیا جائے جس سے لینے والے کی ضرورت رفع اور اس کو فراغت میسر ہو جائے، اس میں ہر شخص کی حالت اور حیثیت کا اعتبار کیا جائے گا، اس کی کوئی ایسی مقدار نہیں متعین کی جا سکتی، جو سب کے لئے ضروری قرار دیجائے، کیونکہ ہر شخص کے حالات جدا جدا ہوتے ہیں"

(معالم السنن ج ۲ ص ۶۶ تا ۶۸)

بعض حدیثوں میں سوال اور اس کا جواب مذکور ہوتا ہے، مصنف نے ایسی حدیثوں پر خاص طور سے بہت اچھی بحثیں کی ہیں، اور بڑے دلچسپ نتائج اور حقائق اخذ کئے ہیں، مثلاً:-

"حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم لوگ کشتیوں پر سمندر میں سفر کرتے ہیں، ہمارے ساتھ اتنا کم پانی

ہوتا ہے کہ اگر اس سے وضو کر لیں تو پینے کے لئے نہ رہ جائے، اس صورت میں سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں، آپ نے فرمایا:-

هو الطهور ماؤه الحل ميتته، اس کا پانی پاک اور مردہ حلال ہے"

اب امام خطابی کی تشریح ملاحظہ ہو:-

اس حدیث میں مختلف النوع معلومات پائے جاتے ہیں:-

(الف) قرآن مجید کی آیت (اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم) سے مخاطب اور سامع کے ذہن میں جس طاہر اور غسول پانی کا تصور آتا ہے، وہ ایسا قدرتی پانی ہے جو اپنی اصلی حالت پر اور ان تمام عوارض و اثرات سے پاک ہو جو اس کو بدل دیتے ہیں، اسی بنا پر ان لوگوں کو سمندر کے پانی کے متعلق جس کا رنگ اور مزہ بدلا ہوا ہوتا ہے، شک و شبہہ پیدا ہوا، اور انھوں نے اس کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اس پانی سے طہارت حاصل کرنا جائز ہے؟

(ب) عالم و مفتی سے جب کوئی چیز دریافت کی جائے، اور وہ محسوس کرے کہ سائل کو...... مسئولہ چیز کے سوا ان چیزوں سے بھی واقف ہونے کی ضرورت ہے، جن کا اسی مسئلہ سے تعلق اور واسطہ ہے، ....

تو ایسی صورت میں مناسب اور مستحب ہے کہ وہ دریافت طلب مسئلہ کے علاوہ اس کے متعلقہ مسائل کا جواب بھی دیدے، اس کو غیر متعلق نہ سمجھا جائے گا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف سمندر کے پانی کے متعلق سوال کیا گیا تھا، آپ نے محض اسی کے جواب پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ سمندر کے کھانے کے متعلق بھی جواب دیا، کیونکہ آپ کو

معلوم تھا کہ جو دشواری اس وقت ان لوگوں کو شیریں پانی کے بارہ میں پیش آئی ہے، وہی دشواری آیندہ سمندر کے زاد راہ کے سلسلہ میں بھی پیش آئے گی، اس لئے اُس پیش آنے والی ضرورت کے متعلق بھی جواب دیدیا،

اس کے علاوہ پانی کی طہارت کا مسئلہ تو اتنا مشہور ہے کہ اس سے عموماً عام و خاص سب واقف ہوتے ہیں، اس کے مقابلہ میں سمندر کے میتہ اور اُس کے حلال ہونے کا معاملہ مشکل ہے، جب آپ نے دیکھا کہ سوال کرنے والا کھلے اور ظاہر مسئلہ سے بھی ناواقف ہے، تو مشکل مسئلہ سے اور بھی ناواقف ہوگا، اس لئے آپ نے اُس کو بھی بیان فرمادیا،

اسی سے ملتا جلتا یہ واقعہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص سے جس نے نماز صحیح طریقہ سے ادا نہیں کی تھی، فرمایا کہ (صل فانک لم تصل) یعنی تم پھر سے نماز پڑھو کیونکہ تم نے ٹھیک طریقہ سے نماز نہیں پڑھی، اس شخص نے تین دفعہ نماز پڑھی، اور ہر دفعہ آپ نے اُس کو دوبارہ پڑھنے کی تلقین کی، یہاں تک کہ آخر میں اُس نے درخواست کی کہ آپ اس کو نماز پڑھنا سکھا دیں، چنانچہ آپ نے نماز سکھائی، اور اس سے پہلے طہارت اور وضو کا طریقہ بھی بتایا، اُس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ نماز کا مسئلہ تو زیادہ واضح اور مشہور تھا، ہر شخص روزانہ اس کا مشاہدہ کرتا تھا، اس کے مقابلہ میں طہارت اور وضو کا مسئلہ زیادہ واضح اور مشہور نہیں ہے، کیونکہ عموماً تخلیہ میں کیا جاتا ہے، اس لئے جب آپ نے دیکھا کہ وہ نماز سے بھی واقف نہیں ہے، تو یہ قیاس کرکے کہ طہارت سے بھی ناواقف ہوگا، اس لئے اس کو بھی واضح فرمادیا،

ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان لوگوں کو سمندر کے پانی کی طہارت سے آگاہ فرمایا اور وہ جانتے تھے کہ سمندر میں حیوانات بھی ہوتے ہیں جو اسی کے اندر مر جاتے ہیں، اور مردہ نجس ہوتا ہے، تو ضرورت کا اقتضا تھا کہ ان لوگوں کو اس قسم کے مردہ کا حکم بھی بتا دیا جائے، کہ وہ دوسرے مردار کے برخلاف حلال ہوتا ہے، اور یہ وہم نہ ہو کہ مردار کی وجہ سے پانی نجس ہوگیا،

(س) حدیث میں اُس کی دلیل بھی ہے کہ سطح آب پر مر جانے والی مچھلی اور پانی سے باہر مر جانے والی مچھلی دونوں حلال ہیں، اس لئے پانی کے حیوانات کے پانی کے اندر اور باہر مرنے میں کوئی فرق نہیں،

(ج) یہ حدیث اس کا بھی ثبوت ہے کہ سمندر میں رہنے والے تمام حیوانات اگر اس کے اندر مر جائیں، پاک ہیں، کیونکہ حدیث میں عام حکم ہے کسی نوع کو دوسری نوع سے مستثنیٰ نہیں قرار دیا ہے،

مگر بعض علما نے یہ تفریق کی ہے، کہ سمندر کے جو جانور خشکی کے ان جانوروں کی طرح ہیں جن کا گوشت نہیں کھایا جاتا جیسے انسان، کتا اور خنزیر وہ حرام ہیں، اور جو خشکی کے ان جانوروں کے مانند ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے، اُن کا گوشت اُن کے مردہ ہونے کے باوجود کھایا جائے گا،

بعض لوگوں نے تو اس میں اس قدر وسعت دی ہے، کہ سمندر کے جانوروں کی صورتیں چاہے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں وہ سب مچھلیوں کے حکم میں ہیں چنانچہ پانی کے اندر رہنے والا سانپ کا جس کی شکل بالکل سانپوں جیسی ہوتی ہے، اور جو مچھلیوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے، کھانا بھی جائز ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان

لوگوں کے نزدیک شکل وصورت کا مختلف ہونا اباحت کے حکم کو مختلف نہیں بنا سکتا، مگر ان لوگوں نے مینڈک کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مارنے سے منع کیا ہے،

(معالم السنن ج ۱ ص ۲۴۳ و ۲۴۴)

توضیح وتشریح کی ایک اور مثال یہ ہے:-

"ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیک طور طریق اور میانہ روی نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے" امام خطابی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ ہے کہ یہ سب عادتیں انبیاء کے شمائل وعادات میں شامل ہیں، اس لئے ان کے فضائل وکمالات کے مختلف اجزاء میں سے ایک جزء یہ بھی ہیں، اس لئے تم لوگوں کو ان عادتوں میں ان کی اقتدا کرنی چاہئے، آپ کا یہ منشاء نہیں ہے، کہ نبوت فی نفسہ کوئی اس قسم کی چیز ہے جس کے اجزاء اور ٹکڑے ہوسکتے ہیں، اور یہ مقصود ہے کہ جس شخص میں یہ عادتیں موجود ہوں اس کو نبوت کا کوئی جزء مل گیا، وہ کوئی کسبی چیز نہیں ہے، جس کو کسب سے حاصل کیا جا سکتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک مخصوص موہبت اور عطا وبخشش ہے، جس سے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے سرفراز فرماتا ہے، اور اللہ خوب جانتا ہے کہ نبوت ورسالت کا مہبط بننے کے لائق کون ہے؟

پھر نبوت کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ختم ہوچکا ہے اگر

بہ فرض محال اس کے اجزاء بھی ہوتے، تو اب وہ کسی میں کس طرح پائے جاسکتے ہیں"

البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہاں نبوت سے اس دعوت اور پیغام کو مراد لیا جائے جو نبوت کا مقصود ہے، اور جس کی تبلیغ واشاعت پر انبیاء علیہم السلام مامور ہوتے ہیں، اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ اعتدال اور اچھے اطوار دعوت نبوت کے ۲۵ اجزاء میں سے ایک جزء ہے،

ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جس شخص میں یہ اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں وہ لوگوں کی نگاہ میں باوقار اور باعزت ہو جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کو تقویٰ کا وہی لباس پہناتا ہے، جو انبیاء کا ہوتا ہے، اس حیثیت سے گویا ان کو نبوت کا ایک جزء کہا گیا ہے"

بعض حدیثوں میں حقیقی مفہوم کے مقابلہ میں ان کا مجازی مفہوم زیادہ دلنشیں اور مناسب ہوتا ہے، امام خطابی نے ایسی حدیثوں کی بھی بہت عمدہ پیرایہ میں وضاحت کی ہے، مثلاً:-

"حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ:-

من نظر فی کتاب اخیه بغیر اذنه فانما ینظر فی النار،	جو اپنے بھائی کی اجازت کے بغیر اس کا خط دیکھتا ہے، وہ گویا آگ میں دیکھتا ہے،

فانما ینظر فی النار" دراصل تمثیل ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح آگ سے حذر کیا جاتا ہے، اسی طرح اس کام سے بچنا چاہئے،

ایک مفہوم یہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے کہ نظر الی النار کے معنی آگ کے قریب ہونا

اور اس میں داخل ہونا"

ایک مشہور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی کے بارہ میں فرمایا :-

" انہا لیست بنجس انہا من الطوافین علیکم والطوافات " کی مشہور تاویل یہ کی جاتی ہے کہ بلی گھر کے خادموں کی طرح ہر وقت اس میں آتی جاتی رہتی ہے، چنانچہ قرآن پاک میں ہے (طوافون علیکم بعضکم علی بعض) یہاں خدام اور ممالیک مراد ہیں، اور دوسری جگہ فرمایا (یطوفون علیہم ولدان مخلدون) اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ارشاد ہے کہ اُن کی حیثیت گھر کے لازمی جزء کی سی ہے،

لیکن اس کی یہ تاویل بھی ہوسکتی ہے کہ بلی اِدھر اُدھر اسی طرح پھرا کرتی ہے جس طرح محتاج اور فقیر مانگنے کے لئے پھرا کرتے ہیں، اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ بلیوں کے ساتھ مواسات کرنے کا وہی اجر و ثواب ملے گا جو محتاجوں کی مدد اور سائلوں کی حاجت روائی کرنے کا ملتا ہے"

بعض حدیثوں کے ظاہری مفہوم کی گنجائش ہونے کے باوجود ان کا مجازی مفہوم لینا زیادہ انسب ہوتا ہے، کیونکہ وہ ہر ذہن و مذاق کے لوگوں کے لئے قابلِ قبول ہوتا ہے، لیکن ظاہری اور اصلی معنی سے عدول و انحراف میں بڑی احتیاط اور فن اور زبان سے مکمل واقفیت ضروری ہے، ذیل میں اس کی بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں :-

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ کے پاس آکر اُن کی تعریف شروع کی، مقداد بن اسود نے مٹی لے کر اس کے چہرہ پر پھینک دی، اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :-

اذا لقیتم المداحین فاحثوا	جب تم مبالغہ سے تعریف کرنے والوں
فی وجوھھم التراب ،	کو پاؤ تو اُن کے چہروں پر مٹی ڈال دو،

امام خطابی فرماتے ہیں :-

"اس سے مراد وہ مداحین ہیں جنھوں نے مدح کو پیشہ بنالیا ہے، اور وہ اس طریقہ سے ممدوح کو دھوکہ دے کر اپنی معاش اور روزی کا انتظام کرتے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص کسی کے اچھے اعمال اور عمدہ کاموں پر اسکی تعریف کرتا ہے تو یہ اس کی جانب سے ممدوح کی حوصلہ افزائی اور اس کو کارِ خیر کے لئے مزید ترغیب دلانے پر محمول کیا جائے گا، کہ وہ اس قسم کے کام آئندہ بھی کرتا رہے، اس تعریف و توصیف سے دوسروں کو بھی اس قسم کے کاموں پر ابھارنا مقصود ہوتا ہے، تاکہ وہ بھی اس کو دیکھ کر اُس کے اچھے کاموں کی تقلید کریں،

اس واقعہ میں حضرت مقدادؓ نے حدیث کو اس کے ظاہری معنی پر محمول کرکے فی الواقع مادح کے اوپر مٹی پھینک دی، اس سے قطع نظر ایک توجیہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں مدح کرنے والوں کو کچھ نہ دینے کی تلمیح ہے، یعنی جو شخص لوگوں کی مدح و توصیف کے درپے ہو اس کو دینے کے بجائے بالکل محروم کردینا چاہئے گویا تراب کا لفظ کنایۃً استعمال کیا گیا ہے، اور اس سے حرمان مقصود ہے، جیسے کہا جاتا ہے مالہ غیر التراب یا ما فی یدہ غیر التراب (یعنی اس کے پاس کچھ نہیں ہے)

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

اذا جاءك يطلب	جب تمہارے پاس کوئی کتے کی قیمت
ثمن الکلب فاملاء کفہ	مانگنے آئے تو تم اُس کی مٹھی میں مٹی

ثوابا، ڈال دو (یعنی اُسے کچھ بھی نہ دو)

اس کی ایک اور مثال یہ ہے :-

"حضرت ابو سعید خدریؓ نے اپنی موت کے وقت نئے کپڑے منگوا کر پہنے اور کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ

ان المیت یبعث فی ثیابه التی یموت فیها، — بیشک مردہ اپنے انہی کپڑوں میں اٹھایا جائے گا جن میں اس کی موت ہوتی ہے،

امام خطابی اُس کی شرح میں لکھتے ہیں :-

"حضرت ابو سعیدؓ نے اس حدیث کو ظاہری معنی پر محمول کیا، اس میں شبہہ نہیں کہ اچھے کفن کے متعلق کئی حدیثیں مروی ہیں، لیکن بعض علماء نے اس کی بالکل دوسری تاویل کی ہے، اُن کے نزدیک ثیاب سے عمل مراد ہے، یعنی کفن کنایہ ہے، اور آپ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ انسان، اسی چیز پر قیامت کے دن اٹھایا جائے گا، جس پر اُس کی موت ہوگی، اہلِ عرب جب کسی شخص کو طاہر الثیاب کہتے ہیں، تو اس سے اُس کی عفت، طہارت نفس اور عیب سے بری ہونا مراد ہوتا ہے، اور دنس الثیاب سے اس کے عیوب و نقائص مراد ہوتے ہیں، حدیث سے بھی اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے آپ نے فرمایا،

تحشر الناس حفاة عراة، — یعنی قیامت میں لوگ ننگے پاؤں اور ننگے بدن جمع کئے جائیں گے،

لہ معالم السنن ج ۴ ص ۱۱۱،

یہ حدیث اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اوپر کی حدیث میں ثیاب سے کفن کے کپڑے نہیں مراد ہو سکتے ہیں، لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ بعث، حشر سے مختلف چیز ہے، اس میں بعث کے وقت کپڑوں کے ہونے کی نفی نہیں ہے،"

(ج ۱ ص ۳۰۱ و ۳۰۲)

بعض حدیثوں میں وسیع اور عام الفاظ و معانی سے مخصوص اور محدود معنی مراد ہوتے ہیں اور کبھی خاص لفظ وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے، اُس کی بھی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :-

"حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم الراشی والمرتشی — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت کی ہے

امام خطابی فرماتے ہیں کہ اس تہدید اور عقوبت کے دونوں اس وقت مستحق ہوں گے جب وہ قصد و ارادہ میں برابر کے شریک ہوں، رشوت دینے والا اگر رشوت کے ذریعہ حرام اور باطل کی طلب و تحصیل کرتا ہے، اور اس کو ظلم و زیادتی کا ذریعہ بناتا ہے تو یقیناً اس لعنت اور پھٹکار کا مستحق ہوگا، لیکن جو شخص اپنے جائز حق کو طلب کرنے یا اپنے اوپر ہونے والے کسی ظلم کو دور کرنے کے لئے رشوت دے تو وہ اس وعید میں شامل نہ ہوگا، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ بلادِ حبشہ میں گرفتار کر لئے گئے، تو دو دینار دے کر رہائی حاصل کی تھی، حسن، شعبی، جابر ابن زید اور عطار رحمہم اللہ سے مروی ہے کہ اگر آدمی اپنی ذات یا اپنے مال پر ہونے والی کسی زیادتی اور ظلم کو روکنے کے لئے رشوت دے تو اس میں مضائقہ نہیں ہے، اسی طرح رشوت لینے والا اس وعید کا اس وقت مستحق ہوگا جب وہ کسی ایسے حق کام کو

جس کی ادائگی اُس کے فرائض میں ہے، بغیر رشوت کے نہ کرے، یا کسی باطل کام کو جس کا
ترک اس پر فرض تھا، بغیر رشوت کے ترک نہ کرے"۔ (ج ۴ ص ۱۶۱)

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ

المسلمون شرکاء فی ثلاث	یعنی مسلمان تین چیزوں میں برابر کے
فی الماء والکلاء والنار،	شریک ہیں، پانی، چراگاہ، اور آگ،

امام خطابی فرماتے ہیں کہ "کلاء" سے مراد افتادہ زمین کی چراگاہ ہے، اس چراگاہ میں
ہر مسلمان اپنے مویشی چرا سکتا ہے، وہ کسی کے لئے مخصوص نہیں، اور نہ کوئی مسلمان
دوسرے مسلمان کو اس سے روک سکتا ہے، زمانہ جاہلیت میں لوگ اس قسم کی چراگاہ کو بھی اپنے لئے مخصوص کر لیتے تھے، اور دوسروں کو اس میں مویشی نہیں چرانے دیتے
تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا، اور اس قسم کی تمام چراگاہوں
میں سب کا حق مساوی قرار دیا، لیکن اگر چراگاہ ایسی زمین میں ہو جو کسی متعین شخص
کی ملکیت میں ہو، تو وہ اس کی ذاتی ملک سمجھی جائے گی، اور اس کی اجازت
کے بغیر دوسرا شخص اس میں اپنے مویشی داخل نہیں کر سکے گا"۔

(ج ۳- ص ۱۲۹)

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ

"جس گھر میں تصویر ہوتی ہے، اس میں ملائکہ نہیں داخل ہوتے، لیکن یہاں
ملائکہ سے وہ فرشتے مراد ہیں جو خدا کی رحمت اور برکت لے کر نازل ہوتے ہیں، کیونکہ
نگرانی کرنے والے فرشتے تو ہر آدمی کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں"۔

(ج ۱ ص ۷۵)

امام خطابی نے حدیثوں کے مفہوم کی توضیح میں جو نکتہ آفرینیاں کی ہیں، اُس کے چند
نمونے بھی ملاحظہ ہوں:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لولا ان اشق علی امتی لامرتھم	اگر میری امت کے لئے شاق نہ ہوتا
بتاخیر العشاء وبالسواک عند	تو میں ان کو عشا کی نماز دیر میں پڑھنے
کل صلوٰۃ،	اور ہر نماز کے وقت مسواک کرنے

کا حکم (ضرور) دیتا،

امام خطابی اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ امر کی اصل وجوب ہے اگر آپکا امر وجوب کو مستلزم نہ ہوتا
تو "لامرتھم" ایک بے معنی بات ہوتی" (ج ۱ ص ۲۹)

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے سامنے وضو کیا، اور پیر دھونے میں ناخن کے پاس کچھ حصہ خشک رہ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا "ارجع فاحسن وضوءک" جاکر پھر سے ٹھیک سے وضو کرو،

امام خطابی اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ وضو میں تفریق جائز نہیں ہے کیونکہ آپ نے
شخص مذکور کو دوبارہ ٹھیک سے وضو کرنے کا حکم دیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دوبارہ تمام
اعضاء کو دھوئے، اگر تفریق جائز ہوتی تو آپ صرف چھوٹی ہوئی جگہ کو دوبارہ دھونے یا اس
پر پانی پہنچا دینے کا حکم دینے ہی پر اکتفا فرماتے اور اس جگہ واپس جانے کا حکم نہ دیتے، جہاں انہوں نے
وضو کیا تھا" (ج ۱ ص ۶۳ و ۶۴)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبرستان تشریف لے
گئے، تو فرمایا (السلام علیکم دار قوم مومنین) امام خطابی ارشاد فرماتے ہیں، کہ اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ زندہ لوگوں کی طرح مردوں پر بھی سلام کیا جائے گا، اور دعا کو اس پر مقدم کیا جائے گا، اور ہر دعار خیر کے موقع پر اس کو ملحوظ رکھا گیا ہے، مثلاً (رحمۃ اللہ وبرکاتہ علیکم اہل البیت) دوسری جگہ ہے (سلام علی الیاسین) اس کے برعکس سلام و دعا کے بجائے تہدید اور بد دعا کے موقع پر اسم کو دعا پر مقدم کر دیا جائے گا جیسے (وان علیکم لعنتی الی یوم الدین)

(ج ا ص ۳۱۷) (باقی)

مدرسہ سراج العلوم

(جھنڈا نگر ۔ نیپال)

اس دینی تعلیمی ادارہ میں جو جھنڈا نگر نیپال میں قائم ہے، اٹھارہ لائق آدمی جو اس کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں، کام کرتے ہیں، دو سو مقامی و بیرونی طلبہ زیر تعلیم ہیں، ان میں ۵۰ بورڈرس ہیں، جن کے قیام و طعام اور دوسری ضرورتوں کا مدرسہ کفیل ہے، تیس ہزار سالانہ اس کا خرچ ہے، تعمیری مصارف اس کے علاوہ ہیں، جن کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے، اس وقت مسجد دار الاقامہ، اور کتب خانہ کی عمارتیں زیر تعمیر ہیں،

امید ہے کہ علم دوست واہل خیر حضرات حدود نیپال کے اس واحد دینی و عربی مدرسہ کی طرف توجہ فرمائیں گے، اور رمضان عید و عید ضحیٰ کے موقع پر اپنا زر اعانت اس پتہ پر بھیج کر عند اللہ ماجور ہوں گے،

مولانا عبد الرؤف رحمانی، کیر آف خان کلاتھ ہاؤس،

(بڑھنی بازار بستی)

"منیجر"

حضرت میر علی عاشقاں سرائمیریؒ

از جناب مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

علوے مرتبت میر صاحب نے راہ طلب کی خاک چھانتے ہوئے دسویں صدی کے مشرقی علمار و فضلا سے اپنی استعداد و جستجو کے اکتساب فیوض و برکات کیا اور سوانہ، دہلی، بہار، جونپور اور نظام آباد کے علمی و روحانی مرکزوں سے حصہ وافر پایا، اور پورب کی یہ سرزمین اس طرح پسند آئی کہ یہیں کے ہو رہے، سرائمیر آپ کے نام سے مشہور قصبہ ہے، اس زمانہ میں پورب کے قصبات و دیہات بڑے پرکشش تھے، اور ارباب ذوق دور دور سے آکر یہاں آباد ہوتے تھے، چنانچہ اسی زمانہ میں میر صاحب کے شیخ الشیخ حضرت راجہ سید حامد شاہ مانکپوریؒ کی نسل سے ایک بزرگ راجہ سید مبارک شاہ ابن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن راجہ سید حامد شاہ نے اس علاقہ کی ایک قدیم مسلم بستی قائم آباد کو اپنے نام سے از سر نو آباد کرکے اس کا نام مبارک پور (اعظم گڈھ) رکھا اور یہیں بود و باش اختیار کی، گویا سرائے میر اور مبارک پور دونوں معاصر اسلامی قصبات ہیں، اور ان کا تاسیسی تعلق دو روحانی بزرگوں سے ہے، میر صاحب نے پہلے سرائمیر سے متصل کھریواں نامی بستی میں بود و باش اختیار کرکے اسی کے قریب مرتضیٰ آباد کے نام سے ایک گانوں بسایا، پھر سرائمیر کو اپنا مسکن بنایا، کسی روایت سے پتہ نہیں چلتا کہ اس کے بعد میر صاحب نے اپنے آبائی وطن سوانہ کا سفر کیا ہو، بلکہ سرائے میر ہی میں رہ کر خلق اللہ کی ہدایت میں پوری زندگی بسر کی، حتی کہ یہیں وفات پائی، البتہ مبارکپور کے بانی راجہ سید مبارک شاہ کا وصال مانکپور میں ہوا،

میر صاحب نے علوم ظاہری و باطنی میں کمال حاصل کر کے دسویں صدی کے تمام مروجہ سلاسل میں خلافت پائی، اور مشیخت کے سلسلہ میں چشتیت کے ساتھ شطاریت کو اپنایا اور پوری زندگی رشد و ہدایت، وجد و کیف اور شریعت و طریقت کی جامعیت میں بسر کی، اپنے معاصرین و اقران میں ممتاز و بلند مرتبہ کے وارث ہوئے، اور ارباب یقین و عرفان میں اپنے خصوصی اوصاف و کمالات میں مشہور ہیں، شاہ عبدالحق صاحب کے والد بزرگوار شیخ سیف الدین جو آپ کے معاصر اور ملنے والے تھے، اپنے خیالات یوں ظاہر فرماتے ہیں "من بملازمت او رسیدہ ام، و از دے سخنان شنیدہ، اثر ذوق و عرفان و طیبت قلب و سرگرمی محبت از کلمات او لائح بود،" خود شاہ صاحب جو میر صاحب کے پہلے سوانح نگار ہیں، لکھتے ہیں " دے از ارباب کمال و سکر و وجد و حال بود، دائم با خود حالتے و سرگرمی داشتے، سخن را مجذوبانہ گفتے[۱] و اکثر او نے کلماتی،" از بندگان ارباب کمال و سکر و وجد و حال، و از کبار مشائخ ہندوستان بودہ[۲]" صاحب اخبار الاصفیا کا قول ہے: "میر سید علی قوام الدین بردا اللہ مضجعہ از سادات بزرگ، و از اولیائے کبار ہندوستان است، و صاحب خوارق عادات[۳]" مشکوٰۃ النبوۃ میں شیخ قاضن کے دو کمل خلفاء میں میر صاحب کو بھی شمار کیا ہے، "یکے میر سید علی قوام کہ کمالات او ظاہر است در نفحاتی جونپور بسرائے میر آں آسودہ است از دے مردم بسیار ارشاد یافتند[۴]" میر صاحب میں سوز دروں اور عشق و محبت کی گرمی پائی جاتی تھی جس کے اثرات کم استعداد والے برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسی لئے آپ کا معمول تھا کہ جب میدان میں گھومنے پھرنے کے لئے تشریف لیجاتے تو کسی کو ساتھ نہیں لیتے تھے، عموماً اس وقت آپ پر غلبۂ حال ہوتا تھا، کرامات الاولیاء میں ہے، "ہر گاہ بصحرا لے بر آمدے، مردم را از ہمراہی خود منع فرمودے، و اگر احیاناً کسے برخلاف ایشاں رفتے از آتش جلال بسوختے،"

۱ اخبار الاخیار ص ۲۲۲ ۲ سفینۃ الاولیاء ص ۱۰۸ ۳ اخبار الاصفیا قلمی ص ۹۵ ۴ مشکوٰۃ النبوۃ قلمی ص ۱۸۲،

اور جب وقت یہ کیفیت طاری ہوتی تھی، زبان پر یہ کلمہ ہوتا تھا "محی الدین چنیں می فرماید و چناں می نماید" یہ کہہ کر عجیب عجیب اسرار و رموز بیان فرماتے تھے[۱]، خزینۃ الاصفیا میں ہے، "سید علی قوام قدس سرہٗ از ارباب کمال و صاحب جذب و سکر و وجد و حال بود[۲]"، شیخ محمد امین بن فضل اللہ محبی شامی نے خلاصۃ الاثر میں شیخ تاج الدین سنبھلی متوفی ۱۰۵۰ھ کے ذکر میں ان کے سلسلے کے مشائخ میں میر صاحب کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے،

السید علی بن قوام الدین الہندی النقشبندی ۔۔۔ کان من اکابر اولیاء اللہ تعالیٰ صاحب تصرفات عجیبۃ وجذب قوی، قال بعض الصالحین ماظہر فی الامۃ المحمدیۃ علی افضل الصلوٰۃ واتم السلام من احد بعد القطب الربانی الشیخ عبد القادر الجیلانی رضی اللہ عنہ من الخوارق والکرامات والتصرفات مثل ما ظہر منہ[۳]	سید علی بن قوام الدین ہندی نقشبندی اکابر اولیاء اللہ میں سے تھے، تصرفات عجیبہ اور جذب قوی کے مالک تھے بعض صلحاء کا قول ہے کہ امت محمدیہ علی نبیہا الصلوٰۃ والسلام میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے بعد آپ سے جس قدر کرامات ظاہر ہوئی ہیں کسی اور سے ظاہر نہیں ہوئیں،

شیخ یوسف بن اسمٰعیل نبہانی نے بھی جامع کرامات الاولیاء میں میر صاحب کے متعلق یہی الفاظ درج کئے ہیں، گلزار ابرار میں شیخ محمد بن حسن غوثی نے لکھا ہے کہ آپ کا جذب سلوک پر

۱ کرامات الاولیاء ص ۱۶۳ ۲ خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۴۲۲ ۳ خلاصۃ الاثر ج ۱ ص ۴۶۵،

غالب تھا، زیادہ زمانہ سکر میں گذرتا تھا، اور کمتر ہوشیاری میں، ہوشیاری میں عجیب حال ہوتا تھا، جب وجد وکیف اور انوار وتجلیات کی حالت ختم ہوجاتی تو نالۂ حسرت وندامت آسمان تک پہنچاتے تھے، اور گریہ وزاری اور سوز وگداز سے ایک لحظہ بھی رہائی نہیں ملتی تھی،[1]

تاریخ الاولیاء میں ہے کہ آپ صاحب کمال ووجد وحال تھے[2]

صاحب نزہۃ الخواطر نے آپکے اوصاف وکمالات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

الشیخ الکبیر الزاھد المجاھد علی بن	شیخ علی بن قوام الدین حسینی اسوانی جونپوری
قوام الدین الحسینی السوانی الجونپوری	مشہور بہ علی عاشقاں شیخ کبیر، زاہد ومجاہد
المشہور بعلی عاشقان السرائمیری	اور ہندوستان کے صوفیہ میں مشائخ
کان من کبائر المشائخ الصوفیۃ بالھند[3]	کبار میں سے ہیں،

ان بیانات کی روشنی میں حضرت میر علی عاشقاںؒ کے علم وعرفان، جذب وکیف، زہد، عبادت، کشف وکرامت اور روحانی سوز وساز کا پورا اندازہ ہوجاتا ہے اور یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ آپ اپنے دور میں ہندوستان کے مشائخ کبار میں کیا مقام ومرتبہ رکھتے تھے،

میر صاحب نے علوم ظاہری کی تعلیم وتدریس کے بجائے علوم روحانی کی تلقین وترویج اور رشد وہدایت خلق کو اپنا مشغلۂ حیات بنایا، اور پوری زندگی اسی میں بسر کی، اور اس کا معیار علوم شریعہ کو بنایا، اور پیروی سنت اور اتباع شریعت کی راہ سے باہر قدم نہیں نکالا،

ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے علی! تو اپنے دروازے پر نوبت بجواتا ہے، اور خلق اللہ کے حال سے بے خبر ہے، عرض کیا یا رسول اللہ! اگر نوبت ہے تو آپکی ہی کی، اور دروازہ ہے تو آپ ہی کا، علی بیچارہ درمیان میں کون ہوتا ہے،

---

[1] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار ص ۱۰۹ [2] تاریخ الاولیاء ج ۲ ص ۲۳ [3] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۴۳،

دینی جمال اور دنیاوی جلال میر صاحبؒ کی زندگی دین ودنیا دونوں کے بہترین امتزاج کا نمونہ تھی، آپ اُن خاصانِ خدا میں سے ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے "آنانکہ در فقیری شہنشاہی کردہ اند" آپ کا کاشانہ ایک طرف دنیاوی جاہ وجلال کا منظر پیش کرتا تھا، حشم وخدم تھے، صبح وشام نوبت بجتی تھی، حرم سرا میں چار چار بیویاں تھیں، ارباب دنیا آپ کے آستانہ پر حاضر ہوتے تھے، مگر آپ کسی بڑے سے بڑے انسان کے دروازے پر نہیں جاتے تھے، فتوحات اور نذرانے کا سلسلہ جاری تھا، جو خدام ومتوسلین اور مستورات پر خرچ ہوتا تھا، دوسری طرف اہل عرفان ویقین کے لئے زاویہ اور خانقاہ تھا جس میں طالبین ومسترشدین غم روزگار اور فکر معاش سے یکسو ہوکر تزکیۂ نفس اور یاد خدا میں منہمک رہا کرتے تھے، خود میر صاحبؒ کا یہ حال تھا کہ آپ کے صحو پر سکر غالب تھا، اور اکثر اوقات وجد وکیف اور سکر وحال کی کیفیت طاری رہا کرتی تھی، مگر اپنے متوسلین کی ہر ذمہ داری پوری فرماتے تھے، اور وجد وحال سے اس میں خلل نہ پڑتا تھا،

سرائمیر میں مستقل قیام کے بعد میر صاحب کی معاش اور واردین وصادرین کی خدمت کی کیا صورت تھی، اس کی تصریح کتابوں میں نہیں ملتی، غالب گمان ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق آپ کو حکومت کی طرف سے کچھ جاگیریں ملی ہوں گی، بعد کے بعض قرائن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، تیرھویں صدی میں آپ کی اولاد میں ایک بزرگ دیوان فضل علی سرائمیری گذرے ہیں جو آپ کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے، سمات الاخیار کی روایت کے مطابق وہ صاحبِ ثروت وفراغت اور کئی مواضع معدودی کے مالک تھے،[1]

فتوحات وعطیات میر صاحب کے فتوحات وعطیات کی تصریح کتابوں میں ملتی ہے، جو بیوی بچوں اور خدم وحشم کے لئے کافی ہوتی تھی، شاہ عبد الحق صاحب نے لکھا ہے "وصول فتوحات بروے

---

[1] سمات الاخیار حاشیہ ص ۱۱۲،

متصل و متوالی بودے، و ہرگز منقطع نگشتے"[1] خزینۃ الاصفیا میں بھی یہی لکھا ہے[2]، فتوحات عطیات کے بارہ میں میر صاحب کا عمل اس حدیث پر تھا، کہ اگر حرص و طلب کے بغیر مال ملے تو اسے قبول کر لو، بعد میں اگر چاہو تو اپنے استعمال میں لاؤ، اور اگر چاہو تو صدقہ کر دو، اور جو مال اس طرح نہ آئے، اس کے فکر میں نہ پڑو، چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اصول تھا کہ آپ خود کسی سے کبھی سوال نہیں کرتے تھے، لیکن اگر کوئی شخص کچھ دے دیتا تو اسے واپس بھی نہیں کرتے تھے[3]،

میر صاحب کا عمل بھی اسی پر تھا، بغیر طلب و خواہش کے جو رقم آتی تھی، اسے لے کر حرم سرا اور خدام پر خرچ کر دیتے تھے،

آپ نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ دنیا میں کسی سے سوال نہ کرینگے، چنانچہ چالیس[4] سال سے زائد مدت تک اس پر اس طرح قائم رہے کہ اپنے کسی ملازم کو بھی کسی کام کا حکم نہیں دیا، حتیٰ کہ پیاس کی شدت میں ان سے پانی بھی نہ مانگتے تھے، اخبار الاخیار وغیرہ میں ہے، "گویند کہ دے تا چہل سال بہیچ خادے امر نکرد"! جس انسان کا حال یہ ہو کہ وہ اپنے خادم تک سے ذاتی خدمت نہ لیتا ہو، وہ دوسروں سے مال و دولت کس طرح طلب کر سکتا ہے،

ذمہ داریوں کا ایفا میر صاحب پر جذب و کیف کا غلبہ تھا، باتیں مجذوبانہ کرتے تھے، مگر زندگی کے تمام فرائض اور ذمہ داریوں کو پورا کرتے تھے، آمدنی کو دو حصہ کر کے ایک حصہ بیویوں کو دیدیتے اور دوسرا خدام پر تقسیم فرماتے تھے، اخبار الاخیار اور خزینۃ الاصفیا میں ہے "چہار منکوحہ داشت و وظیفہ داران بسیار بودند، ہرچہ از فتوح رسیدے نصفے بر وظیفہ داران او قسمت یافتے و نصفے دیگر بر منکوحات"[5]؛ اس بارے میں آپ کا عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر تھا کہ سب سے افضل دینار وہ ہے جسے آدمی اپنے بال بچوں پر صرف کرتا ہے، اپنی سواری پر خرچ کرتا

[1] اخبار الاخیار ص ۲۳۱ [2] خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۲۲۲ [3] بخاری و مسلم [4] اخبار الاخیار ص ۲۳۱ و خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۴۲۲

اپنے دوستوں پر اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے[1] ایمان میں کامل ترین وہ مومن ہے، جو سب سے اچھے اخلاق رکھتا ہے، اور تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے، جو اپنی عورتوں کے بارے میں بہتر ہے[2]؛

لباس میں تنوع لباس میں میر صاحبؒ کسی خاص وضع کے پابند نہ تھے، بلکہ جلال و جمال کی کیفیات کے مطابق مختلف قسم کے کپڑے زیب تن فرماتے تھے، اگر فقر و ولیٹی کی کیفیت ہوتی تو جبہ و دستار کے جمال میں نظر آتے اور اگر استغنا و بے نیازی کی حالت طاری ہوتی، تو فوجی اور سپاہیانہ لباس کے جلال میں نظر آتے، تقریباً سب ہی تذکرہ نگاروں نے آپکے لباس کے بارے میں اس کی تصریح کی ہے، اخبار الاخیار میں ہے "بلباس مقید نہ بودے، گاہے خرقۂ مشائخ پوشیدے، و گاہے لباس سپاہیانہ در بر داشتے" (ص ۲۲۱) سفینۃ الاولیاء میں ہے، "لباس ایشاں معین نہ بود، گاہے خرقہ می پوشیدند و گاہ لباس لشکریاں در بر می کردند" (ص ۱۹) خزینۃ الاصفیا میں ہے "اما مقید بیک حال نبود گاہے خرقۂ مشائخ پوشیدے و گاہے لباس سپاہیانہ در بر داشتے" (ج ۲ ص ۴۲۲) اور گلزار ابرار میں ہے کہ آپ کسی معین لباس کے پابند نہیں تھے، کبھی خرقہ پہنتے تھے، اور کبھی قبا زیب تن کرتے تھے، (اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار ص ۲۰۹)

لباس کا یہ تنوع میر صاحب کی دین دنیا کی جامعیت کو ظاہر کرتا ہے، اس سے دونوں کی شان معلوم ہوتی تھی، خرقۂ مشائخ کے زہد و تقویٰ کا نشان اور سپاہیانہ لباس دنیاوی جاہ و جلال کی علامت تھا، حدیث میں آیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے، کہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کی علامت کو دیکھے، امام مالکؒ نہایت قیمتی کپڑے زیب تن کرتے تھے، اور اسے تحدیث نعمت سے تعبیر فرماتے تھے، بعض عارفین کا قول ہے، بعض اوقات مشایخ کو مخصوص لباس کے بجائے دوسرا لباس پہننا چاہئے، تاکہ مخصوص لباس کی وجہ سے خود اپنے کو اور دوسرے کو غلط فہمی نہ ہو، ایسے لباس سے

[1] رواہ مسلم عن ثوبانؓ [2] رواہ الترمذی عن ابی ہریرہؓ،

ریاکاری کا احتمال ہے،

دروازہ پر صبح و شام نوبت میر صاحب کا کاشانہ شان و شوکت میں امراء و سلاطین کا دربار معلوم ہوتا تھا، صبح و شام دروازے پر نوبت بجتی تھی، یہ رسم آپ کے شیخ الشیوخ حضرت شیخ عبداللہ شطاری کے اصول دعوت و ارشاد کے مطابق تھی، شیخ شطاری کے یہاں دستور تھا، کہ گھوم پھر کر ارشاد و تلقین کرتے تھے، اور نقارہ بجا کر لوگوں کو خداشناسی کی دعوت دیتے تھے، اور اعلان کرتے تھے کہ جس شخص کو خدا کی تلاش ہو میرے پاس آئے، میں اسے خدا سے ملا دوں، گویا میر صاحب کے دروازے پر جو نوبت بجتی تھی وہ اللہ و رسول کا بیانگ دہل اعلان تھا، اس سلسلہ کا خواب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سوال و جواب اوپر گذر چکا ہے،

دنیا داروں سے بے تعلقی میر صاحب کسی دنیا دار کے گھر پر کبھی تشریف نہیں لیجاتے تھے، اگر کسی معاملہ میں ضرورت پڑتی تو اس کو اپنے یہاں بلا لیتے تھے، مگر اس میں بھی احتیاط کا حال یہ تھا، کہ اپنے کسی خادم کو اس کے یہاں نہیں بھیجتے تھے، بلکہ کسی دوسرے آدمی کو بھیج کر بلوا لیتے تھے، خود فرماتے ہیں:-

"من تا بودہ ام بخانہ دنیا دارے نرفتہ ام و ہر کسے را از ایشاں بخانہ خود طلبیدہ ام، و خادم بخانہ کس نفرستادہ ام"

ان احادیث رسول پر شدت سے عمل کرتے تھے، جن میں علماء اور ارباب علم و فضل کو امراء و اغنیاء کے یہاں بلا ضرورت آنے جانے سے منع فرمایا گیا ہے[1] اور ان سے تعلق کو علماء کے حق میں فتنۂ عظیم بتایا گیا ہے[2]،

اس بارے میں آپ نے اپنے زمانہ کے ان اہل طریقت کی اس روش پر تنقید کی ہے جو بظاہر دنیا داروں سے نہیں ملتے اور بے نیازی ظاہر کرتے تھے، مگر اندر اندر ربط و ضبط رکھتے تھے، آپ نے ایسی حیلہ بازی کی سخت مذمت کی ہے، فرماتے ہیں:-

"بعضے مردم کہ بخانہ کس نمی روند، و رقعہ می نویسند و خادم می فرستند، ایں چیزے نیست

۱؎ رواہ مسلم عن ثوبان رض ۲؎ رواہ الترمذی عن ابی ہریرہ رض۔

"ممنوع توجہ بدیشاں است بہر وجہ کہ باشد"[1]

غنا و سماع کے بارے میں اظہار خیال آپ کے دور میں ایسے صوفیہ بھی تھے، جن کا ذوق تصوف نغمہ کا رہین منت تھا، اور وہ حظ نفس کے لئے قوالوں سے فرمائش کرتے تھے کہ فلاں غزل سنائیں، اور اس سماع و غناء پر اُن کو وجد آتا تھا، آپ نے ایسے صوفیہ پر بھی سخت تنقید کی ہے، اور ان کے اس ذوقِ وجد و کیف پر تعجب ظاہر کیا ہے، فرماتے ہیں:-

"مرا عجب می آید ازاں طائفہ کہ بر قوالاں حکم کنند کہ فلاں غزل بگو، ایں را خوش دارم ایں را ناخوش دارم ذوقِ من مقید نیست، مرا ہر چہ بگویند خوش آید، و ہم بر آں ذوق کنم"[2]

میر صاحب نے وجد و سماع کے بارے میں غیر محتاط صوفیاء کا احتساب کرتے ہوئے اپنے ذوق کے بارے میں نہایت صفائی سے ظاہر کر دیا ہے کہ میں بھی کبھی کبھی سماع سے ذوق کرتا ہوں، مگر میرا حال ان لوگوں سے جداگانہ ہے، .... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو سماع سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، اور اس بارہ میں آپ کا حال مخدوم شیخ عبدالقادر بن شیخ محمد حسنی جیلانی ملقب بہ "شیخ عبدالقادر ثانی" جیسا تھا کہ جب وہ مقام شیخیت پر پہنچے تو سماع و غناء سے شدت کے ساتھ پرہیز کرنے لگے، اور مریدوں کو بھی شدت سے منع کرتے تھے، اور اگر کبھی اتفاق سے سماع سے ذوق کر لیتے، تو گریہ و بکا اور بے تابی سے معلوم ہوتا تھا کہ روح پرواز کر جائے گی[3]

سوال نہ کرنے کا عہد حقیقی ترک و تجرید یہ ہے کہ بندہ تمام مخلوقات سے یکسو ہو کر صرف اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھے، کبھی دوسرے سے کسی قسم کا سوال نہ کرے، میر صاحب توکل و تجرید کے اس مقام پر فائز تھے، انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان کیا تھا کہ میں دنیا میں تیرے سوا کسی سے سوال نہیں کرونگا،

۱؎ اخبار الاخیار ص ۲۲۲، ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً ص ۱۹۷۔

اور چالیس سال سے زائد اسی پر قائم رہے، اس مدت میں ابتلا و آزمائش کے بڑے سخت دور آئے، مگر آپ کے عزم و استقلال میں سرِ مو فرق نہیں آیا، سوال نہ کرنے کے بارے میں احادیث میں سخت تاکید آئی ہے،

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مجھ سے عہد و پیمان کرے کہ میں کسی سے سوال نہیں کروں گا، میں اس کے لئے جنت کی ضمانت لیتا ہوں، حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں اس کا وعدہ کرتا ہوں، راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد سے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے کسی سے کوئی سوال نہیں کیا[1]، حضرت عوف بن مالک اشجعی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم نو یا آٹھ یا سات نفر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیعت لی کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کروگے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروگے، پانچ فرض نمازیں ادا کروگے، اللہ و رسول کی اطاعت کروگے، اور ایک بات آہستہ سے یہ فرمائی کہ کسی آدمی سے کسی چیز کا سوال نہ کروگے، حضرت عوف بن مالک کا بیان ہے کہ میں نے ان میں سے بعض حضرات کو دیکھا کہ اگر ان کا چابک گر جاتا تھا، تو کسی سے اٹھانے کا سوال نہ کرتے تھے، اور کہتے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا ہے کہ ہم دنیا میں کسی سے سوال نہیں کریں گے[2]،

تقسیم اوقات اور خدمتِ خلق خدمتِ خلق مشائخِ عظام کا خاص شعار ہے، اور وہ افضل الاشغال خدمۃ الناس کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں، میر صاحب کا عمل بھی اسی پر تھا، اپنے طالبین اور مسترشدین کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے، فجر کے بعد سے اشراق تک اور عصر سے مغرب تک مخصوص کیفیت رہتی تھی، اسلئے ان اوقات میں کسی سے نہیں ملتے تھے، اس کے علاوہ پورا دن خدمتِ خلق میں صرف کرتے تھے،

اخبار الاخیار میں آپ کا قول درج ہے۔

[1] رواہ ابوداؤد عن ثوبانؓ [2] رواہ مسلم

"من خادم فقرائم، تمام روز خدمت گاری ایشاں می کنم، غیر آنکہ درمیان عصر و مغرب مرا معذور دارند، و مزاحم احوالِ من نشوند، کہ دراں یک ساعت بحالِ خود باشم[1]"

خلاصۃ الاثر اور جامع کرامات الاولیا میں ہے کہ میر صاحب کے یہاں قاعدہ تھا کہ چاشت کے وقت تک کوئی شخص ان کے پاس نہ جائے، اس وقت ان پر جذب کا غلبہ رہتا تھا، لوگ اس سے واقف تھے، اس لئے کوئی شخص اس وقت ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتا تھا[2]، اس سلسلہ میں یہ حدیث پیشِ نظر رہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ میرے خاص خاص اوقات ہیں، جن میں مقرب فرشتہ کی بھی گنجائش نہیں ہوتی،

کرامات و خوارق ہندوستان قدیم زمانہ سے سادھوؤں، سنتوں کی سرزمین رہی ہے، جو تپسیا اور ریاضت سے کرتب دکھا کر عوام کو مسحور کرتے رہے ہیں، اس لئے ان کے مقابلہ میں یہاں کے مشائخ اور بزرگانِ دین نے بھی بعض اوقات ضرورۃً کرامتیں ظاہر کی ہیں، جن کا مقصد یہاں کے عوام کو ان کے قدیم اور موروثی ذہن و مزاج کے پیشِ نظر راہِ راست پر لانا ہوتا تھا، انھوں نے ان کے ذریعہ ہزاروں انسانوں کو خدا سے ملایا ہے، میر صاحب کے ہندی تذکرہ نویسوں نے اجمالی طور سے ان کے کشف و کرامت اور خوارق کا تذکرہ کیا ہے، صاحب اخبار الاصفیا نے ان کو "صاحبِ خوارقِ عادات" لکھا ہے[3]، اخبار الاخیار، خزینۃ الاصفیا، اور اخبار الاصفیا میں صرف بعض کرامتیں مذکور ہیں،

وفات ۹۵۵ھ میر صاحب کا وصال سلطان نصیر الدین ہمایوں متوفی ۹۶۳ھ کے دورِ سلطنت میں ۹۵۵ھ میں بمقام سرا امیر ہوا، اور وہیں دفن ہوئے، اخبار الاخیار میں ہے:-

[1] اخبار الاخیار ص ۲۲۲ [2] خلاصۃ الاثر ج ۱ ص ۴۶۹، و جامع کرامات الاولیا، ج ۲ ص ۸۷،

[3] اخبار الاصفیا ص ۹۵،

"قبر او در جونپور است، وفات در سنہ خمسین وتسعمائۃ" (ص ۲۲۲)

خزینۃ الاصفیاء میں بھی یہی تاریخ وفات درج ہے :-

"وفاتِ آں جامع الکمالات بقول صاحب اخبار الاخیار نہصد و پنجاہ ہجری است

و مزار پر انوار در جونپور" (ج ۱ ص ۴۲۳)

کرامات الاولیاء میں ہے :-

"وفاتش در سنہ نہصد و پنجاہ واقع شدہ و مرقد منورش در جونپور است" (ص ۹۲)

سفینۃ الاولیاء میں ہے :-

"وفات ایشاں در سال نہصد و پنجاہ ہجری بودہ، و قبر او در حوالی جونپور در موضع کہ توطن داشتہ اند، و آں سرائے میراں مشہور است، یزار و یتبرک" (ص ۱۵۱)

یہی تاریخ وفات تاریخ الاولیاء (ج ۲ ص ۲۳۰) اور سبحات الاخیار (حاشیہ ص ۱۱۲) میں درج ہے، مگر اخبار الاخیار کے بعض مطبوعہ نسخوں میں غلطی سے خمسین (پچاس) کے بجائے خمس (پانچ) چھپ گیا ہے، اور یہ تصحیف بہت پہلے سے اس کے بعض قلمی نسخوں میں چلی آتی ہے، اسی کو دیکھ کر بعد کے بعض تذکرہ نگاروں نے بھی آپ کی تاریخ وفات ۹۰۵ھ لکھدی ہے، ہمارے علم میں سب سے پہلے گلزار ابرار میں یہ غلطی ہوئی ہے، (اذکار ابرار ص ۲۰۹)

اس کے بعد اخبار الاصفیاء میں بھی "نہصد و پنج آنجہانی شد" لکھا گیا (ص ۹۶ قلمی) اور ان سب کے برخلاف نزہۃ الخواطر میں رسالہ عاشقیہ کے حوالہ سے ۴ صفر ۹۵۵ھ درج ہے (ج ۴ ص ۲۴۶) یعنی تسعمائۃ سے پہلے خمسین "صحیح" اور خمس غلط کو ملا کر "خمس و خمسین و تسعمائۃ" بنا دیا گیا، ہندسوں میں لکھے ہونے، اعداد میں اس طرح کی غلطیاں اکثر ہو جاتی ہیں، اسی لئے علمائے رجال و تواریخ

تاریخ و سنہ کو لفظوں میں لکھتے ہیں، اسی قسم کی غلطی میر صاحب کے پہلے مرشد شیخ قاضنؒ کے سنہ وفات میں ہوئی ہے، صحیح ۸۹۲ھ ہے، جیسا کہ انتصاح کے حوالہ سے نزہۃ الخواطر میں درج ہے :-

"مات فی ثالث صفر سنۃ اثنتین و تسعین و ثمانمائۃ" (ج ۳ ص ۱۴۲)

مگر مشکوٰۃ النبوۃ میں ۹۰۲ھ درج ہے :-

"وفات ایشاں بتاریخ سیوم ماہ صفر سنۃ اثنی و تسعمائۃ" (ص ۱۰۲ قلمی)

اس میں "ثمان مائۃ" سے صرف نظر کرتے ہوئے "اثنتین و تسعین" کو "اثنی و تسعمائۃ" بنا دیا گیا ہے، مفتی غلام سرور لاہوریؒ نے میر صاحب کی تاریخ وفات پر دو قطعات لکھے ہیں، جن میں ۹۵۰ھ درج ہے،

یافت زحق رتبۂ عالی بخلد — سید معصوم معلی علی

سال وصالش چو بجستم ز دل — گفت کہ "مخدوم معلی علی"
۹۵۰ھ

زد و نیا شد بفردوس معلی — علی مخدوم عالی شاہ معصوم

وصال او "علی میر شریف" است — دگر فرما "علی سلطان مخدوم"[1]
۹۵۰ھ — ۹۵۰ھ

میر صاحب کے چار بیویاں تھیں، جن سے اولادیں ہوئی ہونگی، مگر آپ کی کسی اولاد کا ذکر نہ مل سکا، البتہ آپ کی نسل سے گذشتہ صدی میں ایک بزرگ دیوان سید فضل علی سرائمیریؒ تھے، جن کا تذکرہ صاحب سبحات الاخیار نے کیا ہے، کہ آپ سید علی قوام شاہ کی اولاد سے ہیں، اور ان کی خانقاہ

---

[1] خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۴۴۳،

کے صاحبِ سجادہ اور حضرت محبوب الحق شاہ فصیح الدین قدس سرہ (متوفی ۱۲۰۶ھ) کے خلیفہ بھی تھے، صاحبِ ثروت فراغت تھے، کئی مواضع موروثی کے مالک تھے، شاہ فصیح الدین نے اپنی بیٹی کی شادی سید فضل علی سے کی تھی،[1]

چند مرید و خلفاء

میر صاحب نے طلب و اکتساب کے بعد پوری زندگی سرائے میر میں ارشاد و تلقین میں بسر کی، اور ہندوستان کے مشائخ کی طرح آپ نے دیار پورب میں بڑا تبلیغی کام کیا، بہار میں شیخ قاضنؒ سے کسب فیض کرنے کے بعد جونپور میں شیخ بہار الدین سے خلافت پائی، اور شہر جونپور میں مسند مشیخت بچھائی، پھر کچھ دنوں کے بعد نظام آباد میں شیخ عبدالقدوس کی خدمت میں حاضر ہو کر خرقۂ خلافت حاصل کیا، اور سرائے میر کو مرکز ارشاد و تلقین بنایا، اور بقول صاحبِ مشکوٰۃ النبوۃ "از وے مردم بسیار ارشاد یافتند" ان مردم بسیار میں جن چند بزرگوں کے نام و حالات مل سکے ہیں، وہ یہ ہیں،

شیخ مبارک محمدی ماہلیؒ

شیخ مبارک بن خیر الدین محمد ماہلی جونپوریؒ شیخ صدر الدین قریشی ظفرآبادیؒ کی اولاد سے ہیں، ان کے والد شیخ خیر الدین ظفرآباد سے ترک وطن کرکے ماہل (اعظم گڈہ) چلے آئے، اور اس کے پاس ہی اپنے نام پر خیر الدین پور گاؤں آباد کرکے وہیں باپ بیٹے رہنے لگے، شیخ مبارک بعض کتابیں اپنے والد سے پڑھ کر جونپور گئے، اور وہاں کے اساتذہ و شیوخ سے تعلیم کی تکمیل کی، اور طریقت کی تلقین و تربیت اپنے والد سے پائی، اس زمانہ میں میر علی عاشقانؒ کی روحانی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، دور دور کے تشنگانِ علم و عرفاں اس چشمۂ صفا سے سیراب ہورہے تھے، جو شیخ مبارک کے گویا پڑوسی تھے، اس لئے انھوں نے اُن کی طرف رُخ کیا، اور ایک زمانہ تک اُن کی خدمت و صحبت میں رہکر مرتبۂ مشیخت کو پہونچے، میر صاحب نے اپنے

[1] سماتُ الاخیار ص ۱۱۱ و ۱۱۲،

لائق مسترشد و تلمیذ کو محمدی کے لقب سے نوازا، شیخ مبارک نے میر صاحب سے فیض حاصل کرنے کے بعد علائق دنیا سے یکسو ہو کر زہد و عبادت کو شیوۂ زندگی بنایا، اور پوری زندگی ارشاد و تلقین میں بسر کردی، آپ کی ذات سے بہتوں نے فیض حاصل کیا، ۱۴ شوال ۹۸۳ھ کو جونپور میں وفات پائی، "فخر زمانہ" تاریخ وفات ہے، تجلی نور میں آپ کے حالات موجود ہیں،[1]

قاضی حبیب اللہ عثمانی گھوسویؒ

شیخ قاضی حبیب اللہ بن احمد بن ضیاء الدین بن یحییٰ بن شمس الدین بن نصیر الدین بن مفتی حسین عثمانی اصفہانی گھوسوی کا سلسلۂ نسب حضرت عمر بن عثمان بن عفان اور بقول بعض حضرت ابان بن عثمان بن عفانؓ تک پہونچتا ہے، فقہ، اصول اور علوم عربیہ (نحو، صرف، ادب، لغت وغیرہ) میں اپنے دیار کے ممتاز علماء میں اور علوم شرعیہ کے فاضل تھے، گھوسی (اعظم گڈھ) کے قاضی مقرر ہوئے، اور پوری زندگی اسی عہدہ پر اسی مقام میں گذار دی، صاحب نزہۃ الخواطر نے شیخ علی عارف کے رسالہ عاشقیہ کے حوالہ سے تصریح کی ہے، کہ قاضی صاحب موصوف نے طریقت کی تعلیم و تلقین شیخ علی بن قوام الدین جونپوری سے حاصل کی تھی،[2] بعد میں آپکے خاندان میں شیخ عطاء اللہ عثمانی گھوسوی متوفی ۱۰۶۳ھ بڑے عالم و بزرگ گذرے ہیں،

شیخ عبدالصمد سرہندیؒ

شیخ عبدالصمد سرہند کے رہنے والے تھے، جو سوانہ کے قریب ہے، اس اعتبار سے میر صاحب کے ہم وطن تھے، فقہ، اصول اور عربیت کے ممتاز عالم تھے، صاحب نزہۃ الخواطر نے رسالہ عاشقیہ کے حوالہ سے لکھا ہے، کہ شیخ عبدالصمد نے شیخ علی بن قوام الدین جونپوری سے ملاقات کی، اور اُن سے اکتسابِ فیض کیا،[3]

شیخ مبارک جھنجھانوی جونپوریؒ

شیخ مبارک بن عبدالمقتدر بن فاضل علوی جھنجھانوی جونپوریؒ جو طریقت و روحانیت میں اپنے علوِ مرتبت کی وجہ سے "بالادست" کے لقب سے مشہور تھے، شیخ عبدالرزاق

[1] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۷۸، [2] ایضاً ج ۴ ص ۸۵، [3] ایضاً ص ۱۸۳،

جھانوی کے چچا زاد اور رضاعی بھائی تھے، ظاہری و باطنی کمالات و فضائل کے جامع تھے، آپ کی ذات سے خلق اللہ کو بڑا فیض پہونچا، گلزار ابرار میں ہے کہ آپ نے طریقۂ شطاریہ سید علی ابن قوام الدین شطاری جونپوری سے حاصل کیا، اور مدتوں ان کی خدمت و صحبت میں رہ کر فیض اٹھایا، آپ کا مولد و مدفن دونوں جھنجھانہ ہے[۱] آپ کے خلفاء میں شیخ الٰہ بخش شطاری گڈھ مکتیسری متوفی ۱۰۰۲ھ بڑے صاحب فضل و کمال گذرے ہیں، جو شیخ تاج الدین سنبھلی کے مرشد تھے، اور محبی نے خلاصۃ الاثر میں شیخ تاج الدین سنبھلی کے تذکرہ میں اُن کے شیخ الشیخ علی بن قوام الدین سرائمیری کا ذکر بھی کیا ہے،

قاضی منجھلہ جونپوری آپ علم فقہ اور علوم عربیہ کے ممتاز علماء میں تھے، جونپور کے قاضی مقرر ہوئے اور ایک مدت تک اس عہدہ پر رہکر خدمات جلیلہ انجام دیں، اس کے الگ ہونے کے بعد شیخ علی بن قوام الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے طریقۂ شطاریہ عشقیہ حاصل کیا،[۲]

شیخ منجھن شطاری کمال پوری آپ نہایت متقی و صالح عالم تھے، شرعی امور میں سخت دار و گیر فرماتے تھے، رسالہ عاشقیہ کے حوالہ سے نزہۃ الخواطر میں ہے کہ شیخ منجھن نے طریقۂ شطاریہ عشقیہ میر علی بن قوام الدین جونپوری سے حاصل کیا، اور ایک مدت تک اُن کی خدمت میں رہکر مرتبۂ کمال کو پہونچے،[۵]

---

[۱] اذکار ابرار ص ۲۳۶، [۲] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۳۶۶، [۵] ایضاً ص ۳۶۷،

عروس البلاد بمبئی کی تاریخی سرگذشت

از

جناب انور احمد صاحب سوپاروی

بمبئی مغربی ہند کی اس ساحلی پٹی پر واقع ہے جسے مہا بھارت نے اپرانت، اور عرب سیاحوں نے کنکن اور کمکم لکھا ہے، اور جو عہد عتیق ہی سے دنیا کی مختلف اقوام کی تجارتی سرگرمیوں کی آماجگاہ رہی ہے، اجنبی قومیں اس خطہ میں آکر ایک دوسرے سے روشناس ہوئیں، اس کی بندرگاہوں نے صدیوں تک تجارتی قافلوں کا خیر مقدم کیا، مصر، عراق، یمن، یونان، چین اور ایران کے قدیم باشندے تجارت کے سلسلہ میں یہاں آئے، اس طرح دنیا کی قدیم ترین تہذیب کے پاسبانوں کو ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے کا نہ صرف موقع ملا، بلکہ ایک دوسرے کے ثقافتی اثرات سے بھی متاثر ہوئے،

درحقیقت بمبئی جسے ہندوستان کا اسکندریہ تصور کیا جاتا ہے[۱]، اُس کی قدیم تاریخ تاریکی میں ہے، اور اب تک جن حضرات نے اس خوشنما بستی کے ماضی کو کریدنے کی کوشش کی ہے، وہ اس کی تاریخ کے ابتدائی دور پر روشنی ڈالنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے، ایس، ایم، ایڈورڈز (S. M. Edwardes) نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف کا آغاز ہی اس جملہ سے کیا، کہ بمبئی کی قدیم تاریخ وقت کی تاریکی میں گم ہے[۲]، اس کی وجہ تاریخی وسائل کی کمیابی ہے، بمبئی کا تعلق براہ راست

---

[۱] The Origin of B'bay page 5 By Dr. G. Daeunha

[۲] The Rise of B'bay by S. M. Edwardes

علاقہ کوکن سے ہے اور چونکہ خود کوکن کے بعض تاریخی پہلو اب بھی صیغۂ راز میں ہیں، اس لئے اس "افتادہ" دور خطہ کے تاریخی انکشافات کی کیونکر توقع کی جاسکتی ہے، جو عہد قدیم میں سات جدا جدا جزائر پر مشتمل رہا ہے، چنانچہ غیر ملکی اقوام کی آمد تک کی تاریخ کوکن کا انطباق بمبئی کی تاریخ پر بھی کیا جاسکتا ہے،

عہد عتیق کے باشندے شیرون کولی ماہرین کا قیاس ہے کہ اول اول جب بنی نوع انسان نے ان جزائر میں بود و باش اختیار کی، وہ غالباً پتھر کا زمانہ رہا ہوگا، اس مفروضہ کی تصدیق بیک بے (Back Bay) اور کلابہ ضلع کے ساحلی علاقہ سے سنگی ہتھیاروں کی دریافت سے ہوتی ہے، یہ ہتھیار یورپ کے ان انسانوں کے ہتھیاروں سے مشابہت رکھتے ہیں، جو غاروں میں رہتے تھے، تاہم اس کی پوری تحقیق مشکل ہے، کہ یہ لوگ کہاں سے وارد ہوئے، اور کس قوم سے تعلق رکھتے تھے، ؟ یہ محض ایک قیاس ہے، کہ وہ جنوبی ہند سے ترک سکونت کرکے یہاں آ کر بستے تھے[۱]

سب سے قدیم ترین حوالہ بطلیموس (Ptolemy) (۱۵۰ء) کی تصنیف سے ملتا ہے[۲] جس نے اس مجموعۂ جزائر کو ہپٹا نیسیہ (Heptanesia) کے نام سے تعبیر کیا ہے[۳] نامور مورخ لاسین (Lassen) کی رائے میں ہپٹا نیسیہ سے مراد جزائر بمبئی ہی ہیں[۴] اور کوکن کو اریکا (Ariaka) کہا ہے تاہم اس عہد میں بمبئی میں بجز چند ماہی گیروں کے تمدنی زندگی کے واضح آثار کا کوئی پتہ نہیں چلتا، ڈاکٹر ڈاکونہا کی تحقیق ہے کہ یہ ماہی گیر (کولی، در اصل دراوڑی یا نیگرو سے بڑی حد تک مشابہ تھے[۵] امتداد زمانہ کے ساتھ ہندوستان

---

[۱] Bombay city Gazetteer Vol II P. 1/2

[۲] The Rise of Bombay By S.M Edward P. 3

[۳] The origin of Bombay Dr Dacunka P. 23

[۴] The origin of Bombay P. 40

کے مغربی ساحل کے بعض مقامات میں متوطن ہوگئے تھے، اُن کی نسل کے لوگ آج بھی بکثرت پائے جاتے ہیں، اور کولی کے نام سے موسوم ہیں،

اس سلسلہ کی ایک بات غور طلب اور تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے، وہ یہ کہ ضلع تھانہ کے ساحل پر بسنے والے کولیوں، کو سون کولی (Son-Koli) یا شیرون کولی (Shron Koli) کہا جاتا ہے، اور یہ ان کی کہانیوں (بدھ مت) میں شمالی کوکن کو شیرون یا سون اپرانت لکھا جاتا ہے[۶] اور سون یا سوناگ (Sonag) دراوڑی زبان میں یاون غیر ملکی (Yavan) یا گریک (Greek) کے ہم معنی ہے[۷] اس زمانہ میں غیر ملکی عناصر کا اثر و رسوخ کافی بڑھ گیا تھا، اس لئے الفاظ کی اس غیر معمولی مماثلت سے ان کولیوں اور غیر ملکی قوم کے درمیان کسی ایسے رشتہ کا گمان ہوتا ہے، جو تاریخی نقطۂ نظر سے مزید تحقیق طلب ہے، ڈاکٹر ڈاکونہا کولیوں کو دراوڑی نسل سے بتلاتے ہوئے لکھتا ہے، کہ کولی وندھیاچل کے میدان مرتفع (حدب) (Plateau) گجرات اور کوکن کے علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے، بمبئی میں یہ لوگ تین مختلف فرقوں پر مشتمل ہیں، جو ڈونگری سے مجگاؤں کے وسطی علاقے میں رہتے ہیں، لفظ کولی کے[۸] متعلق مختلف تصریحات ملتی ہیں، بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ سنسکرت لفظ کولا بمعنی پالتو سور سے مشتق ہے، جو آریہ قوم نے ہندوستان کے اصلی باشندوں کے لئے حقارۃً استعمال کیا تھا، بعض کہتے ہیں کہ کول کشتی سے مناسبت رکھتا ہے، اور بھر خوان کا پیشہ (ماہی گیری) کا تعلق بھی براہ راست کشتی سے مناسبت

---

[۶] Thana Gazetteer Vol XIII Part II 1882 P. 407

[۷] "سون کولی" ونیر ندی کے جنوب میں ساحلی علاقہ پر آباد ہیں، جو سمندر پار کی کسی قوم سے خونی رشتہ کی وجہ سے الگ سمجھے جاتے ہیں، یہ لوگ قد میں چھوٹے، مضبوط، قدرے خوبصورت ؟

رکھتا ہے، اور پھر خود ان کا پیشہ (ماہی گیری) کا تعلق بھی براہ راست کشتی سے ہے، یہ کولی لفظ کول (Kul) بمعنی گروہ خیل) سے بنا ہے، یعنی ہم خیل (Clansman) جیسا کہ لفظ کنبی (Kunbi) کُٹمب (Kutumb) بمعنی خاندان سے مشتق ہے،[۵۱] مگر چونکہ اس لفظ کا مسلمانوں کی آمد سے قبل تک رواج نہیں تھا اور راجپوتانہ شمالی گجرات میں ناپسند کیا جاتا تھا، اس لئے قیاس ہے کہ یہ ترکی لفظ کولہ (Koleh) سے بنا ہوگا،[۵۲]

یہ جزائر (بجز سالسیٹ کے) صدیوں تک سنسان اور غیر آباد رہے، بعض ماہرین کا خیال ہے، ہزاروں سال قبل اس سرزمین میں زلزلے آئے ہوں گے، جن کے اثر سے یہ سات جدا جدا جزیروں میں منقسم ہوگئی، انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں پرنسس ڈاک کے لئے جب کھدائی کی جارہی تھی، تو ایک زمین دوز جنگل کے نشانات کا پتہ لگا، یہ جنگل سطح زمین سے ستیئس فٹ

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۷) بعض موٹے ہوتے ہیں، اور مرہٹی بولتے ہیں، اور ان کی بول چال میں بعض الفاظ نہ صرف اجنبی ہیں، بلکہ ناقابل فہم پائے جاتے ہیں، گفتگو بلند آواز میں کرتے ہیں، چاول ان کی مرغوب غذا ہے، وہ مذہباً ہندو ہیں، اور ان کے دیوی دیوتاؤں میں کھنڈے راؤ، بھوانی، بھیرو، بابا دیو، دیو، کالکائے، جیدا، اور ماروبائی مشہور ہیں، [۵۳] The Rise of Bombay By S. M. Edworden P. 8 [۵۴] بمبئی کے کولیوں میں موریے اور چالکے خاندانی القاب پائے جاتے ہیں، جو موریہ اور چالوکیہ کی بگڑی شکلیں ہیں، اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ موریہ اور چالوکیہ خاندان ان کولیوں کی سماجی زندگی پر کس قدر اثر انداز ہوئے تھے، یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ یہ خاندان (موریہ اور چالوکیہ) کولی قوم سے تعلق رکھتے ہوں،

[۵۱] The origin of Bombay P. 40 - 41

[۵۲] Bombay city Gazetter PT P. 142

کی گہرائی میں نکلا، اور مجموعی طور پر ۳۸۲ درخت ملے جن میں دو سو تیئیس[۲۲۳] درختوں کی جڑیں زمین میں پیوستہ تھیں، اور ایک سو انسٹھ[۱۵۹] درخت زمین پر اوندھے پڑے تھے، مگر ان کی بھی جڑیں زمین میں سلامت تھیں،[۱]

تاریخ دور اول کا آغاز

سب سے اول یہ علاقہ اشوک کی وسیع قلمرو میں شامل تھا جس کے بعد جنوبی ہند کا سب سے طاقتور اور نامور خانوادہ ساتواہن برسراقتدار آیا، ان کے زمانہ میں بھی یہ جزائر (سالسٹ کے سوا) سنسان اور غیر آباد پڑے ہوئے تھے،[۲] البتہ سالسٹ میں واقع کنہری کے غاران کے دور حکمرانی کی تاریخی یادگار ہیں،[۳] یہاں کے گپھا نمبر ۱۳ - اور ۸۱ میں یگن شری ساتکرنی گوتمی پتر کے سنگی کتبے بھی ملے ہیں،[۴] اشوک کے عہد میں یہ مقام بدھ مذہب کی تعلیمات اور علوم کی اشاعت کا سرچشمہ تھا، یہاں سے بدھ مذہب کے بھکشو آس پاس کے علاقوں میں جاکر اپنے مذہب کے پیغام کو لوگوں تک پہنچاتے تھے،

ساتواہن کے زوال کے بعد چوتھی صدی عیسوی میں شمالی کوکن کی تاریخ منتبہ ہوجاتی ہے،[۵] بلاشبہ گپت خاندان کی سلطنت کی حدود جنوب میں دور تک چلی گئی تھیں لیکن شمالی کوکن کا جہاں تک تعلق ہے، ان کی حکمرانی سے متعلق کوئی تاریخی حوالہ نظر نہیں آتا، البتہ شمالی کوکن کے بعض مقامات سے اس کے سکے ملے ہیں، پانچویں صدی بھی اس خطہ کی تاریخ کا دھندلا سا عکس پیش کرتی ہے، اس صدی میں تری کوٹک (Trai Kuta Ka) نامی ایک غیر معروف

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۸) [۵۵] قلابہ،[۱] بمبئی،[۲] مجگاؤں،[۳] پریل،[۴] ورلی،[۵] ماہم،[۶] سائن،

[۱] ایضاً ذیٹ The Gazetteer of Bombay city and island Vol II 1909 (ص ۱)

[۲] ایضاً ص ۶، [۳] Dynasties of The Kanarese Districts By Dr Fleet P. 24

[۴] ۵ (حاشیہ) Thana Gazetteer Vol XIII P 412

[۵] Gazetteer Bombay city Part II Vol II P. 7

خاندان حکمران نظر آتا ہے[۱]

راشٹرکوٹ کے راجہ کرشن کے سکے

راشٹرکوٹ خاندان کے ایک حکمران کرشن (۳۷۵ تا ۳۷۷ شک) کے سکے بمبئی (۱۸۸۱ء) اور سالسٹ (جون ۱۸۸۲ء) میں ملے جن سے یہاں کے حکمراں خاندانوں کے دور حکمرانی میں بے ترتیبی پیدا ہو گئی ہے[۲] ڈاکٹر فلیٹ (Dr Fleet) کی رائے ہے کہ یہ سکے کالاچوری خاندان کے کرشن راجہ کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں، مگر اس سے اس خانوادہ کے دور حکمرانی کے بارہ میں صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی[۳] البتہ اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں انسانوں کی آبادی اس خطۂ زمین پر موجود تھی، یہ سکے اپریل ۱۸۸۱ء میں کا ول (Cannel) اسٹریٹ کے قریب پائے گئے تھے، اس مقام پر دوسرے سکوں کے بھی ملنے کے قوی امکانات تھے، مگر زمین کے بنیا مالک کے اعتراض کی بنا پر مزید تلاش سے احتراز کیا گیا، ان میں سے دو سکے ایشیاٹک سوسائٹی کی ایک نشست (۱۵ جولائی ۱۸۸۱ء) میں نمائش کے لئے رکھے گئے تھے[۴] ایک سکہ کی عبارت حسب ذیل تھی،

"پرم ماشیور ماتا پتری پادو نودھیاتر شہر، کرشن راجہ"

کرشن راجہ کے تعلق مختلف تاویلیں ملتی ہیں، مگر یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کا کس خانوادہ

---

۱ The Gazetteer of Bombay city and island vol II P. 7-8

۲ Thana Gazetteer vol II P. 419

۳ Dynasties of the Kanarese Districts by Dr Fleet P. 296

۴ The origin of Bombay P. 7

سے تعلق تھا، وہ راشٹرکوٹ یا کالاچوری خاندان کا حکمراں تھا، اور اس کے سکوں کی بناوٹ گریک سکوں کی ساخت سے بڑی حد تک مشابہت رکھتی ہے[۱]

پوری موریہ کا خوبصورت پایۂ تخت

راشٹرکوٹ خاندان کے بعد غالباً چھٹی صدی عیسوی میں موریہ خاندان شمالی کوکن (مع جزائر بمبئی) پر قابض ہو گیا، ان کا پایۂ تخت جزیرۂ پوری (ایلی فنٹا) تھا، جہاں غاروں میں سیاحوں اور محققین کی دلچسپی اور کشش کا بڑا تاریخی مواد ہے، اگار شیہ ڈی اورتا (Rade a iade orta) نے ۱۵۳۴ء میں اس خوبصورت جزیرہ کی سیاحت کی تھی، وہ لکھتا ہے:-

"یہاں پوری نامی جزیرہ میں ایک خوبصورت پگوڈا (Pagoda) ہے، اور ہم اسے ہاتھی کا جزیرہ (Island of The Elephant) کہتے ہیں، یہاں ایک بلند پہاڑی کو کاٹ کر اس کے اندر ایک خانقاہ بنائی گئی ہے، جس کی دیواروں میں سنگ تراشی کے نہایت عمدہ اور نفیس نمونے ہیں، جو قابل دید ہیں،[۲]

سیماؤ بوٹیلہو (Simao Botelho) رقمطراز ہے، کہ جزیرہ پوری ۱۵۴۸ء میں جاو پیریز (Jao pirez) نامی ایک عیسائی کو ٹھیکہ پر دیا گیا،[۳] اس جزیرہ کے بارہ میں پرتگالی سیاحوں کے بیانات میں بڑی دلچسپ باتیں ملتی ہیں، فرائر اوڈرک (Frair oderic) ۱۳۲۲ء میں لکھتا ہے:-

---

۱ The origin of Bombay P. 13

۲ The Rise of Bombay Dr Dacunha P. No 18

۳ ایضاً ص نمبر ۲۱

"یہ (پوری) قدیم زمانہ میں ایک مشہور مقام تھا، یہ شہر دراصل پورس نے آباد کیا تھا، جس نے سکندر اعظم سے جنگ کی تھی"[1]

مگر گا وشیہ ڈی اورتا کی رائے ہے کہ یہ (پوری) چینیوں نے بسایا تھا،[2] اور گسپارو بالبی (Gasparo Balbi) ۱۵۸۰ء میں اس کے بابت لکھتا ہے، کہ سکندر اعظم نے اپنی فتوحات کی آخری حد پر یہ شہر بسایا تھا۔[3] موریہ خانوادہ کی اس خوشنما بستی پوری کے متعلق ہماری معلومات میں چالوکیہ خاندان کے ساتویں صدی عیسوی کے ایک کتبہ سے اضافہ ہوتا ہے، جس میں پوری کو "مغربی سمندر کی کشتی" کہا گیا ہے، اور جس پر پولیکسی (Pulakesi) نے سیکڑوں بحری جہازوں کے ساتھ حملہ کیا تھا" اس عبارت سے پوری کے محل وقوع کی بارہ میں اختلاف رائے کا خاتمہ ہوجاتا ہے، وہ عبارت یہ ہے،

"پوری ایک دلکش اور دولت وثروت میں مشہور زمانہ شہر تھا، اور لب ساحل پر آباد تھا"

"اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مورہ بندر ہی قدیم "پوری" تھا، پچھلی صدی میں پورٹ ٹرسٹ کے قیام کے وقت جو کام ہو رہا تھا، اس کے دوران میں تانبے کی دو تختیاں دستیاب ہوئی تھیں جو بدقسمتی سے ضائع ہوگئیں، اس کے علاوہ سونے کی انگوٹھی میں جڑی ہوئی یاقوتی رنگ کی ایک مہر بھی ملی تھی، جس پر "نارائن" منقوش تھا، یہ پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی سے تعلق رکھتی ہے"[4]

---

[1] The origin of Bombay by Dr Dacunha P.No 21

[2] The origin of Bombay P. 21

[3] ایضاً

[4] The origin of Bombay P. 22

موریہ خاندان کی پرسکون اور خوش حال حکمرانی شاید چالوکیہ کے لئے ناقابل برداشت تھی، چنانچہ کرتی ورمن اول (۵۶۶ء تا ۵۹۷ء) نے شمالی کوکن پر فوج کشی کردی، اور اس کے بیٹے پل کیشن دوم نے موریہ سلطنت کا کلی طور پر قلع قمع کردیا،[1] پوری قدرتی مناظر کی خوبصورتی و دلکشی اور اقبال مندی کے باعث اس زمانے میں مشہور تھا، تاہم اس مقام کی بابت اختلاف رائے ہے، جیسا کہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں، پروفیسر ولسن (Wilson) کی تحقیق ہے کہ پوری ضلع تھانہ میں واقع تھا، اور سر جیمز کمپ بل (Sir James Campbell) اسے ایلی فنٹا جزیرہ کے شمال مشرق میں واقع مورے بندر سے تعبیر کرتے ہیں، بہرحال جزیرہ ایلی فنٹا کی مشہور گپھاؤں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، کہ جزیرہ پوری ہی موریہ سلطنت کا مرکزی شہر رہا ہوگا، جیسا کہ کوسن (Cousens) نے اپنی رپورٹ میں توضیح کی ہے،[2]

چالوکیہ کی سلطنت پر نویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں زوال کے بادل چھانے لگے، چنانچہ ۸۱۰ء میں شمالی کوکن کے سلہارا خاندان کو عروج ہوگیا، جس کے بیس[3] حکمرانوں

---

[1] Thana Gazatteer vol II P. 412

[2] Bombay Gazatteer Jani 1901

[3] سلہارا، شیلاہار، شریلار، شیلارا، اور سلارا، دراصل ایک ہی خانوادہ کے نام ہیں، ان کے کتبوں میں بھی یہی نام ملتے ہیں، لاسین (Lassen) کی رائے میں سلہارا افغانی ہیں، افغانستان میں (Silar) "کافر" اب تک موجود ہیں، (Thana — Gazetteer vol XIII P II P 422)
لفظ سلہارا کس زبان سے تعلق رکھتا ہے؟ اس کے متعلق قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے، غالباً یہ غیر سنسکرت مراٹھی لفظ ہے، مراٹھی میں شیل (Shel) بکرے کے لئے بولا جاتا ہے، اور شیلار (Shelar)

شمالی کوکن (مع جزائر بمبئی) پر ۸۰۰ء تا ۱۲۶۰ء حکومت کی، اُن کے زمانہ میں تھانہ، سنجان، سوپارہ، کلیان، بسین، اُرن، اور چول وغیرہ مشہور شہر اور تجارتی مرکز تھے، اس خاندان کے تمام حکمرانوں کے ناموں کی تفصیل ہنوز تاریکی میں ہے، ملک ارجن راجہ نے ۱۱۵۶ء سے ۱۱۶۰ء تک حکمرانی کی، جسے مہانند کا لڑکا بتایا جاتا ہے، اس کی راجدھانی شتانند پور تھی، جس کے چاروں طرف سمندر محیط تھا، شتانند غالباً "پوری" کا دوسرا نام تھا، شتانند پور کو ڈیگو دو کوٹو (Diogo do Couto) نے سولہویں صدی میں سنتوپوری لکھا ہے، انہی اس نام کی وجہ تسمیہ کی بابت لکھا ہے کہ بن سوڑ راجہ کے زمانہ میں اس قطعہ ارض پر

(بقیہ حاشیہ ص ۴۵۳) قبیلہ کے افراد اب بھی اس صوبہ میں پائے جاتے ہیں، جو بکرے کا گوشت کھانے سے اجتناب کرتے ہیں، بنگال کے "کولاری" قوم میں بھی یہ رواج ہے، دنبہ اُس کے قبیلے کا امتیازی نشان ہے، اس لئے وہ اس جانور کا احترام بھی کرتے ہیں، بحوالہ Thana Gazetteer Vol XIII P. P. 730

مگر جیمز برڈ (James Bird) نے سلہارا کو راجپوت بتایا ہے،

(مرآت احمدی، تاریخی تعارف ص ۱۶)

خانوادۂ سلہارا تین حکمراں گھرانوں پر مشتمل تھا، (۱) جنوبی کوکن کے سلہارا (۲) شمالی کوکن کے سلہارا اور کولہاپور کے سلہارا، اور کولہاپور کے سلہارا، تینوں خاندانوں میں کیا تعلق تھا، اس کا تاریخ کو علم نہیں، البتہ تینوں گھرانے اپنے آپ کو خرافاتی جیموت واہن کی نسل سے (Jimuta Vahana) بتاتے ہیں، بحوالہ

[۱] The Silaharas of western
By A.S Altekar P 373

تقریباً تین گھنٹوں تک خالص سونے کی بارش ہوتی رہی، جس کے باعث اس کا نام سنتوپوری رکھا گیا[۱] مگر اس دلچسپ روایت کی تاریخی حیثیت ظاہر ہے، خانوادہ سلہارا کے حکمراں فنِ تعمیر سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ شمالی کوکن میں اُن کے عہد کے آثار جابجا نظر آتے ہیں، بمبئی میں بھی والکیشور کا مندر انہی کے زمانہ کی یادگار ہے،

سومیشور (Someshwar) اس خاندان کا آخری تاجدار تھا، جس نے دیوگیری کے راجہ مہادیو کے ہاتھوں ۱۲۶۰ء عیسوی میں شکست کھائی تھی، اس کی موت کے بعد اس کا سارا علاقہ سلطنت دیوگیری میں ضم کردیا گیا[۲]، ۱۲۷۱ء میں مہادیو فوت ہوگیا، اور رام دیو سر آرائے سلطنت ہوا، ڈاکٹر فلیٹ کے بیان کے مطابق ۱۲۷۲ء میں مہا پردھان (وزیر اعلیٰ) اچویت نایک (Chyuta Nayaka) علاقہ سالسٹ پر راجہ رام دیو کی طرف سے گورنر مقرر تھا[۳] مگر شہر تھانہ میں پائی گئی تانبے کی ایک تختی سے جسے سب سے پہلے واتھن (Wathan) نے شائع کیا تھا، پتہ چلتا ہے کہ شک ۱۲۱۲ (مطابق ۱۲۹۰ء) میں کرشن نامی ایک بھاردواج (Bhardvaja) برہمن رام دیو کی طرف سے پورے کوکن پر ناظم اعلیٰ کے فرائض ادا کرتا تھا، اس خاندان کے ایک حکمران کے متعلق کنہری گپھاؤں کی گپھا نمبر ۷۸ میں ایک کتبہ (شک ۷۷۵ء) ملا ہے، اس میں تحریر ہے کہ

[۱] The origin Bombay P 32

[۲] The Silaharas western India
by A.S Altekar P No 417

[۳] Dynasties of the Kanarese Districts
D Fleet P 529

"سلہار راجہ شمالی کوکن پر حکمران ہے، جس کا پایہ تخت پوری ہے، اور اس کے وزیر کا نام "بنبو" ہے، اس حکمران نے بدھ مت کے ماننے والوں کے لئے عبادت گاہیں تعمیر کرائیں، ان کو عطیات دیئے، اور وقتاً فوقتاً بھکشوؤں کی مالی اعانت بھی کرتا رہتا ہے"، ایسا ہی ایک کتبہ پریل (Parel) (بمبئی) کے علاقے میں پرانے گورنمنٹ ہاؤس کے قریب میں ملا تھا جس پر اپرادتیہ (A. Paradiya) کے ایک گرانقدر عطیہ کا ذکر ہے، یہ کتبہ ۱۱۸۷ء سے تعلق رکھتا ہے[1]۔

علاؤالدین خلجی کا حملہ

۱۲۹۴ء میں علاء الدین خلجی دیوگیری پر بلائے بے درماں کی طرح نازل ہوا، اور اس کے مقابلہ میں رام دیو کو ہزیمت اٹھانی پڑی، اس شکست سے یادو خاندان کی سلطنت کا نظام برہم ہوگیا اس کے دو لڑکے شنکر دیو اور بمب دیو (بھیم دیو) تھے، بھیم دیو نے شمالی کوکن کی طرف راہ فرار اختیار کی اور اس پر مسلط ہوگیا، اور جب اس کا اقتدار مستحکم ہوگیا، تو اس نے ماہم (بمبئی) کو پایۂ تخت بنایا اور (۱۶۲۴) گاؤں پر مشتمل شمالی کوکن کو پندرہ ضلعوں پر تقسیم کر دیا[2]، بھیم دیو کے ساتھ پیٹھن سے ۹ یجر ویدی برہمن خاندان اور مختلف ذات والے کل ۵۶ خاندان آئے تھے، جن میں سوم ونشی، سُریہ ونشی، بھنڈاری، وغیرہ قابل ذکر ہیں[3]۔

بھیم دیو کے شمالی کوکن پر قابض ہونے کا تذکرہ مراٹھی کتابوں میں پایا جاتا ہے، جسے بعض مؤرخین نے غیر مستند قرار دیا ہے، ڈاکٹر سن ڈ کنہا کے بیان کے مطابق بھیم راج سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں ہزیمت اٹھا کر جنوب کی جانب فرار ہوگیا، اور ماہم (بمبئی) پر قابض ہوگیا[4]، اور یہ بھو

[1] The origin of Bombay P 26
[2] Early History of The Town and Island of Bombay by P.B Joshi P.10
[3] ایضاً ص ۱۱ [4] The origin of Bombay P. 39

جو اپنے آپ کو "پاٹھارے" یا "پاٹھنے" کہتے ہیں، ان کا تعلق گجرات کے شہر پاٹن سے ہے، نہ کہ دکنی شہر پیٹھن سے[1]، مگر تاریخ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، محمود غزنوی کے کوچ کے بعد بھیم راج انہل واڑا لوٹ گیا، اور سومناتھ کے مندر کو ازسر نو تعمیر کرنے کی تدبیر پر غور کرنے لگا[2]، یہ مندر پہلے لکڑی کا تھا، جو محمود غزنوی کے ہاتھوں تباہ ہوا، بھیم راج ۱۰۶۴ء تک حکمرانی کرتا رہا، اس لئے اس کے جنوب کی جانب آنے کے واقعہ میں صداقت نظر نہیں آتی ہے، اور یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ محمود غزنوی کے حملہ کے وقت کوکن پر سلہار خاندان حکمراں تھا، تانبے کی تختی (۹۴۸ شک مطابق ۱۰۲۵ء) سے اس کا انکشاف ہوتا ہے، کہ چھتراج کوکن کے ۱۴۰۰ دیہاتوں پر قابض تھا، اور کسی تاریخ میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے، کہ گجرات کے سالنکی خاندان کے کسی راجہ نے کوکن پر اس عرصہ میں حکمرانی کی تھی[3]۔

صوبۂ دمن کے نواب چاند خان کے ایک فرمان (۹۰۱ھ مطابق ۱۴۹۵ء) کے مطابق جب بمب دیو کو علاء الدین خلجی کے ہاتھوں اپنے باپ رام دیو کی شکست کا علم ہوا تو وہ راج گرو پرشتم بٹ کو لے اور گیارہ چیدہ امیروں کو لے کر براہ سمندر قلعہ پارنیرا (Parnera) باردی، سنجان، دمن اور شیر گاؤں پر قابض ہوگیا، اس کے بعد ماہی ماہم (بمبئی) پہنچا، اور اپنی ریاست کو بارہ منطقوں میں تقسیم کر دیا، مالاڈ (بمبئی) اور اس کے اطراف کے چند گاؤں اپنے راج گرو کو (Kavale) کو بخش دیئے، ایک دوسری فارسی سند (جس پر سلطان بیدر علاء الدین کے دیوان محمد دلیل کی ثبت ہے)

[1] The origin of Bombay P. 39
[2] ہسٹری آف گجرات ص ۶۱
[3] Rise of Bombay By S.M. Edward P.24

P.24

میں بھی بمب دیو یا بھیم دیو کے شمالی کوکن پر متصرف ہونے کا ذکر ہے کہ ۱۲۹۰ء میں راجہ بمب شاہ نے کرسن ( ) سے یہ علاقہ اپنے اقتدار میں لے لیا، یہ مملکت سارت بھاٹ سے دمن تک کل چودہ پرگنوں پر مشتمل تھی[1]،

جب بھیم دیو جزیرہ ماہم میں وارد ہوا، تو یہ علاقہ سنسان اور خاردار جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا، اور اس کی آبادی کولیوں اور کوکنی مسلمانوں پر مشتمل تھی، اور صرف دو مندر تھے، جزیرہ ماہم نوالے (Newale) اور بارود بیٹ (Barad Bet) کے نام سے موسوم تھا، بھیم دیو نے ماہم یا ماہی کاوتی (Mahi Kavati) کا نام تجویز کیا، اس نے اپنے لئے ایک محل تعمیر کرایا، باغات اور ناریل کے درخت لگوائے، اپنی خاندانی دیوی، پربھا دیوی کا مندر بنایا، دراصل اسی عہد سے بمبئی کی ترقی کا آغاز ہوا،

راجہ بھیم دیو ۱۳۰۳ء میں فوت ہو گیا، اور اس کا بیٹا پرتاب بمب یا پرتاب شاہ[2]

---

[1] The Rise of Bombay P. 25

[2] بھیم دیو کو بھیم شاہ یا بمب شاہ بھی کہتے ہیں، ایک فارسی دستاویز کی رو سے تنک ۱۳۰۱ء (؟) میں راجہ رام دیو اپنے بیٹے بھیم دیو کے ساتھ علاء الدین خلجی کے دربار میں گیا تھا، جہاں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، بادشاہ دہلی نے اسے اپنا بیٹا بنا کر "شاہ" کے خطاب سے سرفراز کیا،" یہ سچ ہے کہ راجہ رام دیو نے دہلی کا سفر کیا تھا، مگر دستاویز مذکورہ کا سنہ مستند قرار نہیں دیا جا سکتا، دہلی دربار میں اس کی بڑی عزت افزائی ہوئی، اور اسے اس کا کھویا ہوا ملک بھی لوٹا دیا گیا تھا، اور نوساری کا علاقہ بھی اس میں مزید شامل کر دیا گیا تھا، اور ایک لاکھ ٹنکہ (سکۂ رائج) اس کے ذاتی مصارف کے لئے بادشاہ کی طرف سے منظور کئے گئے تھے،

(Bombay Cagetteer vol. I Past II
Page: 532

تخت نشین ہوا، اس کی حکمرانی کے دور سے کوئی قابلِ ذکر واقعہ وابستہ نہیں ہے، البتہ اس نے اپنے عہد میں ماہم کے علاوہ مارول (Marol) کو بھی اپنا مرکزی شہر قرار دیا تھا، اور اسے پرجاپوری یا پرداپور کا نام دیا، ۱۳۲۱ء میں چیول کے حکمراں ناگردیو (Nagerdev) نے اسے شکست دے کر اس کی حکومت چھین لی، تاہم خود ناگردیو کو اس کی اس ریاست کا جبری انضمام راس نہیں آیا، ۱۳۴۷ء میں یہ سارا علاقہ سلطان دہلی کے صوبۂ گجرات میں شامل کر دیا گیا، اور چند ہی سالوں بعد گجرات میں ایک جداگانہ آزاد مملکت کا قیام عمل میں آیا، گجرات کا یہ حکمراں خانوادہ ۱۵۳۴ء تک ان جزائر پر قابض رہا،

(باقی)

ہندوستان عربوں کی نظر میں

ہندوستان کی قدیم تاریخ سے متعلق قدیم عرب مصنفین خصوصاً عرب جغرافیہ نویسوں، سیاحوں اور مورخین کی کتابوں، سفرناموں اور تاریخوں میں جو بیش قیمت مواد پھیلا ہوا ہے اور جو تاریخ کے طالب علموں کے لئے بہت کارآمد ہے، اس کو دارالمصنفین نے بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ دو جلدوں میں جمع کرایا ہے، ان میں ابن ندیم، عبدالقادر بغدادی، قاضی صاعد اندلسی، عبدالکریم شہرستانی، قاضی رشید، ادریسی، ابن ابی اصیبعہ، ابن بطوطہ، قلقشندی وغیرہ کی کتابوں اور سفرناموں کے اقتباسات اور ان کا اردو ترجمہ ہے، تاکہ جو لوگ عربی نہیں جانتے وہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں،

جلد اول	ضخامت: ۴۰۱ صفحے	قیمت :- [illegible]
جلد دوم	" "	قیمت :- [illegible]

"منیجر"

اردو میں ترکی زبان کے الفاظ

از

جناب ڈاکٹر اکمل ایوبی ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی

ترکی ایک سیدھی سادی اور جامع زبان ہے، اس کا تعلق نہ تو عبرانی، اور عربی جیسی سامی زبانوں سے ہے اور نہ ہی سنسکرت اور فارسی جیسی آریائی زبانوں سے۔ یہ بذات خود ایک مستقل زبان ہے اور یورال الطائی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے، جس کو تورانی خاندان بھی کہتے ہیں، اس وقت ترکی زبان تقریباً پچیس ۲۵ ممالک میں بولی جاتی ہے، اور دس ملکوں میں اُسے قومی زبان کا درجہ بھی حاصل ہے، اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد بھی اس وقت تقریباً بارہ ۱۲ کروڑ ہے، جو ولاڈی واسٹک سے لے کر یوگوسلاویہ تک پھیلے ہوئے ہیں، ہمارے ہندوستان میں البتہ ترکی زبان بولنے والوں کی تعداد صفر کے برابر ہے لیکن ہم ہندوستانیوں کے لئے ترکی قوم کوئی نئی یا گمنام قوم نہیں ہے، ترکوں سے ہمارے قدیمی روابط رہے ہیں، اور ان تعلقات کی ابتدا پہلی صدی قبل مسیح میں "یوچی" نامی ترکی قبیلے کی آمد سے ہوئی، اور یہ کسی نہ کسی طرح بہادر شاہ ظفر کے عہد کے خاتمہ تک برقرار رہے، اس دو ہزار سال کی طویل مدت میں "ترک شاہی" کے علاوہ غزنوی، غوری، ایبکی، التتمش، بلبن، خلجی، تغلق، تیموری، برید شاہی، قطب شاہی جیسی ترکی حکومتیں ہندوستان میں قائم ہوئیں، ان ترکی حکومتوں کے شہنشاہوں کی مادری زبان ترکی تھی جو اپنے تمام ترقی یافتہ اسالیب، زور بیان اور حسن ادا کے ساتھ ہندوستان بھی آئی، اور یہاں

کے تمدن، معاشرت، سماج، اخلاق، ادب اور زبان پر گہرا اثر ڈالا، اسی کی وجہ سے ہندوستان کا لسانیاتی ڈھانچہ متاثر ہوا، اور ایک ایسی نئی زبان نے جنم لیا جس کو خود ہندوستان کے ترک حکمران شاہجہاں نے "اردو" کے شاندار نام سے سرفراز فرمایا[۱]، اس زبان کو ترکوں نے پروان بھی چڑھایا ہے، اردو زبان کے دو مشہور ادیب و شاعر امیر خسرو اور مرزا غالب سے کون واقف نہیں ہے، ان دونوں ہستیوں کا تعلق ترک خاندان سے تھا،

ہمارا اردو دان طبقہ اس امر سے اچھی طرح واقف ہے، کہ لفظ "اردو" اصل کے اعتبار سے ہندوستانی نہیں ہے، اردو لفظ خالص ترکی ہے، اور اس کے معنی سانپ کا بل، کھیل کی صف، بادشاہ کا محل، فوج یا لشکر، فوجی دستہ، اور کیمپ کے ہیں[۲]، لیکن یہ سن کر ضرور تعجب ہوگا کہ ترکی اور اردو زبانوں کے جملوں میں لفظوں کی ترتیب عموماً ایک جیسی ہوتی ہے، اور ایک زبان کا ترجمہ اگر دوسری زبان میں لفظ بہ لفظ کر دیا جائے، تو وہ خود بخود با محاورہ ترجمہ ہو جاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں یہ دعوی کر رہا ہوں کہ اردو زبان فارسی اثرات

۱؎ ڈاکٹر تاراچند کا کہنا ہے کہ "لفظ اردو کو ہندی کے معنی میں غالباً سب سے پہلے مصحفی نے استعمال کیا ہے، میر اپنے تذکرۂ نکات الشعراء میں زبان اردوے معلی کا نام استعمال کرتے ہیں، یہ نام قائم کے مخزن نکات (۱۷۵۴ء) میں بھی ملتا ہے، دکن کا ایک شاعر باقر آگا لفظ اردو ۱۷۷۲ء میں استعمال کرتا ہے اور علی ابراہیم خان صاحب تذکرۂ گلزار ابراہیم ہیں بھی ۱۷۸۳ء میں یہ لفظ استعمال کرتے ہیں، عطا حسین، تحسین مصنف نوطرز مرصع (۱۷۷۰ء یا ۱۷۹۶ء) زبان اردوے معلی کا ذکر کرتے ہیں۔ میر امن اپنی باغ و بہار (۱۸۰۱ء) کی زبان کا نام اردو بتاتے ہیں، (دیکھئے معارف نمبر ۳ - جلد ۴۰، بابت ستمبر ۱۹۳۷ء - ص ۲۱۲)

۲؎ ہندوستان کے ایک مشہور اسکالر کا خیال ہے کہ لفظ اردو ترکی لفظ (Ortu) سے ماخوذ ہے،

سے پاک ہے، تاریخ شاہد ہے کہ اردو زبان کو فارسی نے بڑی حد تک متاثر کیا ہے، اس کے علاوہ اردو پر عربی اور سنسکرت کے اثرات بھی موجود ہیں، لیکن میرے خیال سے ترکی اثرات ان زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں، اور ڈاکٹر حمید اللہ کا یہ قول صحیح ہے کہ (Urdu is more turkish than Persian.) یعنی اردو میں ترکی عناصر فارسی کے مقابلہ میں زیادہ ہیں[5]،

اردو زبان ہندوستان کی پیداوار ہے، اس کا تعلق آریائی زبانوں سے ہے، اس کی صرف نحو مقامی ہے، اس کے افعال، ضمائر اور روابط وغیرہ بھی ترکی نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود ہماری اردو زبان ترکی سے براہ راست اور بالواسطہ دونوں طریقوں سے بڑی حد تک متاثر ہوئی ہے، اردو زبان میں فارسی کی اضافت جیسے صاحبِ قلم اور عربی کی اضافت جیسے بیت المال دونوں کا استعمال بکثرت ملتا ہے لیکن ان صورتوں کے علاوہ اردو زبان میں بغیر علامتِ اضافت کے دو اسموں کو ملا کر مرکب لفظ بنانے کی بھی متعدد مثالیں موجود ہیں جیسے بوٹ پالش، جیب گھڑی، سبزی منڈی، ڈاک گھر، گھنٹہ گھر وغیرہ، چونکہ یہ قاعدہ فارسی اور عربی کے بجائے ترکی زبان میں موجود ہے، اس لئے میرے خیال سے یہ ترکی زبان ہی کا اثر ہے، جو اردو نے قبول کر لیا ہے،

ترکی زبان میں وصفیت یا فاعلیت کی علامت "چی" اور "جی" ہے، اس سے بنے ہوئے متعدد الفاظ

(بقیہ حاشیہ ص ۴۶۱) دیکھئے پروفیسر سید مقبول احمد صاحب کا مضمون "موجودہ ہندوستان میں اردو کی حیثیت" جو رسالہ فکر و نظر علی گڑھ کے شمارہ مسلسل ۳۰ (جلد ۸، نمبر ۲) بابت ماہ جنوری ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا ہے، خود ترکی کے چند اہل قلم حضرات نے لفظ اردو کی بنیاد کو لفظ [illegible] یعنی تخت یا قلعہ بتایا ہے، اور بعض نے اس لفظ کا رشتہ ترکی مصدر (urmak) بمعنی مارنا سے ملایا ہے، لیکن لفظ اردو کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، یہ لفظ مرکب اسم نہیں ہے، بلکہ مفرد اسم ہے،

[5] Die Welt Des Islams, N.S. Vol. III, NR. 3-4, P. 132

اردو میں مستعمل ہیں، اردو میں اس کے اضافے سے بہت سے نئے الفاظ بنائے گئے ہیں جن کو ہم عام گفتگو میں بلا تکلف استعمال کیا کرتے ہیں، مثلاً بندوقچی، نقارچی، نقلچی، مشعلچی، طبلچی، خزانچی، توپچی، ایلچی وغیرہ، اسی طرح ترکی الفاظ پر ہندی افعال لگا کر نئے مصادر بھی آزادی کے ساتھ بنائے گئے ہیں، اور اس طرح ذخیرۂ الفاظ میں قابلِ قدر اضافہ کیا گیا ہے، اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، "قرق" ترکی لفظ ہے، اس میں "کرنا" کا اضافہ کرکے "قرق کرنا" مصدر بنایا گیا ہے، "قابو" بھی ترکی لفظ ہے، اس میں "پانا" کا اضافہ کرکے "قابو پانا" مصدر بنایا گیا ہے، اسی طرح "چملکہ" سے "چملکہ لینا"، افسوس سے افسوس کرنا، تلاش سے تلاش کرنا، سراغ سے سراغ لگانا، ناغہ سے ناغہ کرنا یا ہونا، یورش سے یورش کرنا، تلاشی سے تلاشی لینا، کوچ سے کوچ کرنا، جیسے مصادر بنائے گئے ہیں۔

ترکوں کا ابتدائی مذہب آسمان پرستی یا آتش پرستی تھا، لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے شامانیت، بدھ مت، مسیحیت اور آخر میں مذہب اسلام اختیار کر لیا تھا، اسلام کے حلقہ بگوش ہونے اور مسلم علاقوں میں ہجرت کرنے کی وجہ سے ترکوں نے اپنی مادری زبان میں عربی و فارسی زبانوں کے صرف الفاظ ہی شامل نہیں کئے، بلکہ ان زبانوں کا طرزِ تحریر بھی اپنا لیا تھا، اسی اسلامی جوش و خروش کی وجہ سے انھوں نے اپنا مخصوص قدیم رسم الخط بھی ترک کر دیا، اور عربی رسم الخط کو اپنا لیا، اس کے معنی اُن کے تمدن، معاشرت، سماج، اخلاق، ادب اور زبان کی تبدیلی کے تھے، لیکن ترکوں نے اسے برداشت کیا، اس کا ایک طرف تو یہ اثر ہوا کہ ترکی زبان میں عربی و فارسی الفاظ کی تعداد بڑھ گئی، لیکن دوسری طرف عربی و فارسی زبانوں میں بھی ترکی الفاظ کے داخلے کی راہیں کھل گئیں، ترکی حکومتوں کے قیام سے اس کو اور فروغ حاصل ہوا، چنانچہ ہماری اردو زبان میں جو ترکی الفاظ مستعمل ہیں، وہ فارسی زبان کے ذریعہ بھی اُردو میں داخل ہوئے ہیں اور اُس کا سہرا اصل میں ان ادیبوں اور شاعروں کے سر ہے، جن کا تعلق ایوان شاہی اور فوج کے ساتھ

ہی ساتھ ہندوستانی عوام سے بھی تھا، اور جنھوں نے ترکی زبان کے الفاظ اپنی فارسی شاعری و نثر میں استعمال کئے، اور بعد میں انھیں اردو میں منتقل کر دیا،

ہندوستان میں ترکوں کے ابتدائی دور میں فوج کا اکثر و بیشتر حصہ ترکوں ہی پر مشتمل ہوتا تھا، جو ترکستان سے مسلسل آتے رہتے تھے، بعد کے زمانہ میں ہندی عناصر کو فوج میں غلبہ حاصل ہوا، لیکن سپہ سالار اور دوسرے اہم افسر عام طور پر ترک ہی ہوا کرتے تھے، اور چونکہ فوجیوں کا تعلق عوام سے بھی ہوتا تھا، اس لئے آپس کے لین دین کے باعث فوجیوں کی زبان علاقائی زبانوں پر اثر انداز ہوئی، اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ترکی الفاظ داخل ہو گئے، اس کام میں ان ترکی ادیبوں، شاعروں اور عالموں اور فن کاروں نے بھی ضرور مدد کی ہوگی، جو منگولوں کے طوفانی حملوں کی وجہ سے اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر ترک سلاطین ہند کے زیر سایہ پناہ لینے کے لئے آگئے تھے، اور ہندوستان ہی میں آباد ہو گئے تھے، اس کام میں افضلیت کا شرف ترکی فوج ہی کو حاصل ہے، اس کی اصل وجہ غالبًا یہ ہے کہ ہندوستان کی زبانوں میں جو ترکی الفاظ داخل ہوئے ہیں، وہ ادبی و دینی نہیں ہیں، بلکہ عام ترکی تہذیب و تمدن اور خاص کر فوج سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً توپ، چاقو، قینچی، چقماق، چقمق، توپچی، ایلغار، اردو، درو غہ، یورش، سپاہی، نقارہ، تمغہ، تاب، لیغار، غول، نچی، قمہ، قنات، چق، چچہ، توشک، غالیچہ، جاجم، جرگہ، لاش، کرتہ، نقب، وغیرہ کو دیکھئے، جس طرح ہم کھانا پکانے والے خانساماں کو "باورچی" کہتے ہیں، جو ترکی لفظ ہے[1]، اسی طرح ہمارے بہت سے کھانوں کے نام بھی ترکی ہیں، قورمہ، قیمہ، دولمہ، قلفی، باقر خانی وغیرہ کا مزہ ہم سب لیا ہی کرتے ہیں، یہ سب ترکی الفاظ

[1] لفظ باورچی، "باور" "ارچی" سے مرکب بنا ہے، باور کے معنی یقین کرنا، اعتبار کرنا ہیں، اورچی کلمۂ نسبت ہے اس طرح باورچی کے معنی جس پر اعتبار کیا جائے، ہیں، اور اس اعتبار کا تعلق کھانے پینے کے ساتھ ہے،

ہی ہیں، ہماری اردو زبان میں ترکوں کے سماجی القاب بھی موجود ہیں جن میں سے باجی، خانم، خانم، بیگ، خاتون، آتالیق، اتا، بی بی، آپا، آغا، خاقان، آفندی، آقا، پاشا، بیگم، بابا، بیوی وغیرہ ہم روزمرہ استعمال کیا کرتے ہیں، ان کے علاوہ اور بھی ترکی زبان کے الفاظ اردو زبان میں موجود ہیں، اور اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم لغت مرتب ہو سکتی ہے[1]، پھر بھی قارئین کی تفریح طبع کے لئے چند مزید ترکی الفاظ پیش کئے جاتے، جو ہماری اردو زبان میں رچ بس گئے ہیں، چشمہ، چیچک، بلاق، بکشی، بقچہ، قلی، قزاق، پائچہ، جیب، تزک، تلاشی، تومان، چاق، چاؤش، چپقلش، ساچق، سودا، سوداگری، سوغات، تماز، قاش، کلابتو، قمچی، کمرہ، گنگ، کوچک، کوشک، کوک، لال، لالہ، شال، تندور، ناغہ، نقب، نقارہ، سپاہی، آوارہ، تنکہ، شلوار، یاشا لوار وغیرہ،

[1] عثمانیہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر یوسف الدین صاحب ایسی ہی لغت تیار کر رہے ہیں،

الدرۃ الیتیمۃ

کا

ایک تنقیدی مطالعہ

از

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی ایم اے پی ایچ ڈی لکچرر شعبۂ عربی، ونکٹیشور یونیورسٹی، آندھرا

اگرچہ عربوں نے نقد شعر پر غیر معمولی کاوش سے کام لیا، مگر نثر کی تنقید پر انھوں نے توجہ نہیں کی، بعد میں جب سرکاری ضرورتوں کے باعث نثر کی اہمیت بڑھ گئی، اور توقیعات کا رواج ہوا، تو سرکاری مراسلت کے متعلق کئی کتابیں محاسنِ نثر پر لکھی گئیں، اس لئے نقد نثر کا آغاز چوتھی صدی میں ہوا، جب کہ نظم کی تنقید کے آثار عصر جاہلیت ہی سے نظر آنے لگتے ہیں، عبدالرحمن بن عیسیٰ ہمدانی نے اپنی کتاب الفاظ الکتابیۃ[1] میں نثر کی اہمیت کے بارہ میں لکھتے ہیں:۔

"ادب بہترین پیشہ ہے جس کے ذریعہ ادیب دنیا میں عزت و عظمت حاصل کر سکتا ہے، اس کا قلم اس کا قلم اس کو اعلیٰ درجات تک پہنچ سکتا ہے"[1]

نثر کی تنقید کے سلسلہ میں ابن مقفع کی کتاب "الدرۃ الیتیمۃ" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہ کتاب قعر گمنامی میں پڑی تھی، امیر البیان علامہ امیر شکیب ارسلان نے اس پر مقدمہ لکھ کر اس کو شائع کیا، اس کی اہمیت کے بارہ میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] الالفاظ الکتابیۃ مصنفہ ہمدانی (بیروت ۱۸۸۵ء) ص ۰۸

قد جمعت بین اعلیٰ طبقات	یہ رسالہ اعلیٰ طبقات بلاغت اور بلند
البلاغۃ واسمی درجات	کلماتِ حکمت کا جامع ہے، اس میں
الحکمۃ وتضمنت من الحکم	ذہن نشین ہو جانے والے کلمات
البوالغ والحجج الدوافع مالم	اور ایسے بلند دلائل موجود ہیں، جو
یتضمنہ کتاب قبلہا و	اس سے قبل یا اس کے بعد کی کسی
لا بعدہا فکانت حریۃ	کتاب میں نہیں ملتے، یہ اس لائق
بان یتخذہا الکاتب منہج	ہے کہ منشی اس کو فن کا مرجع اور
لبہ وحماطۃ قلبہ وان	قلب کا مرکز بنائیں، اور اُس کو
یجعلہا دستور انشاءہ	اپنے انشار کا دستور قرار دیں، اور
ومثال احتذاءہ[1]	اس کی پیروی کریں،

یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ عرب ناقدوں کا نظریہ یہ تھا کہ اگر کسی شخص کو شاعری یا نثر نگاری کے اصول و قواعد سے واقف کرا دیا جائے، اور اس کے عمدہ نمونے پیش کر دیئے جائیں تو ان فنون پر کافی قدرت حاصل ہو سکتی ہے، اسی بنا پر وہ فنِ تنقید کو "صنعت" کہتے ہیں، ابو ہلال عسکری نے اپنی کتاب کا نام اسی نظریہ کے تحت "کتاب الصناعتین" رکھا ہے، یہ تصور عرب ناقدوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں، بلکہ قرون وسطیٰ اور اس کے بعد کے دور میں دنیا کے سارے ناقدین کے بارہ میں ادیب اسی انداز سے سوچتے تھے، "الدرۃ الیتیمۃ" بھی اسی تصور کے ماتحت لکھی گئی، البتہ اس کتاب پر امیر شکیب کا تبصرہ موجود عصری رجحانات سے مطابقت نہیں رکھتا، جس کا

---

[1] الدرۃ الیتیمہ لعبد اللہ بن المقفع تعلیق امیر شکیب ارسلان محمود علی صبیح میدان الازہر، مصر ص ۱۵-۱۶،

لحاظ ضروری تھا، موجودہ دور میں تنقید وادب کے پیمانے بہت کچھ بدل چکے ہیں،

اب ناقدین ادب صرف ادیبوں اور شاعروں کی رہنمائی کے لئے نہیں لکھتے، بلکہ تنقید کے پڑھنے والے بھی اُن کے پیشِ نظر ہوتے ہیں، ابنِ مقفع نے جو اپنے دور کا زبردست انشا پرداز ادیب اور مترجم ہے، اپنی تنقید میں اپنے دور کے رجحانات کا پورا لحاظ رکھا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ ثقیل کلام "مردم آزاری" کا باعث ہوتا ہے، اس لئے لوگوں پر اس کو لادنے سے احتراز لازم ہے[1]،

اس نے اس عبارت کی تعریف کی ہے جس سے پڑھنے والے کو بات چیت کا لطف حاصل ہو، وہ لکھتا ہے کہ متقدمین کی کتابیں جاندار اسلوب بیان کی حامل ہیں، ان میں فن و بلاغت ہے، جب نئے دور کے ادبا اُن کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ انکو مکالمہ معلوم ہوتا ہے[2]، یعنی وہ صحیح و سلیس زبان لکھتے تھے،

ابنِ مقفع اپنے دور کے رجحانات کی ترجمانی کرتا ہے، اس دور میں بادشاہوں، امیروں اور ذی اقتدار اشخاص کی اہمیت تھی، اس کا اندازہ ان تمام کتابوں سے ہوتا ہے، جو نثر کی تنقید میں تصنیف کی گئیں، ان سب میں بادشاہوں اور امیروں سے متعلق القاب، آداب طرز تخاطب اور اُن کے حسب مراتب الفاظ کی پوری فہرست درج کی گئی ہے، یا اس بارے میں مفصل ہدایات دی گئی ہیں، صیرفی نے قانون دیوان الرسائل میں اور ہمدانی نے الالفاظ الکتابیۃ میں یہی انداز اختیار کیا ہے، اسی بنا پر ابن مقفع نے ہدایت کی ہے کہ بادشاہوں اور امیروں کے لئے ان کے مرتبے کے مطابق الفاظ و القاب استعمال کرنا ضروری ہے،

ایک مقام پر لکھا ہے کہ ادیب کا فرض یہ ہے کہ وہ اس کلام کو حفظ کرلے جو اس کو پسندیدہ معلوم ہو جو کلام لوگوں کو ناپسند ہو اس کا رُخ نہ کرنا چاہئے، ورنہ وہ نکما ہو کے دور ہو جائے گا،

[1] الدرۃ الیتیمہ ص ۱۴، [2] ایضاً ص ۱۴ - ۱۵۔

مدح و ستائش کی حرص بعض اوقات ادیب کی پوزیشن خراب کر دیتی ہے، اور زود نگاری میں غیر معیاری باتیں اس کے قلم سے نکل جاتی ہیں، ادیب کو عجلت میں ایک جملہ بھی نہ لکھنا چاہئے، جلدی میں غلطی کا امکان بڑھ جاتا ہے، بلکہ غور و فکر کے بعد ہی لکھنا چاہئے کسی بات کو نہ کہنا غلط طرز اظہار سے بہتر ہے، ایک صحیح جملہ ان بہت جملوں سے بہتر ہے، جو عجلت میں نامناسب الفاظ سے لکھے گئے ہوں[51]،

ابن مقفع عام عرب ناقدوں کی طرح اس امر کا شاکی ہے، کہ متقدمین نے متاخرین کے لئے کچھ نہیں چھوڑا، اور ہر ممکن عنوان پر انھوں نے اپنے فکر و فن کے جوہر دکھائے ہیں[52]،

اُن کا یہ خیال کہ معانی محدود ہیں، اور متقدمین نے سارے معانی استعمال کر ڈالے اور متاخرین کے لئے کوئی موضوع نہیں چھوڑا، یہ تصور صحیح نہیں، دراصل یہ زندگی کی وسعتوں اور انسانی افکار کی گہرائیوں سے ناواقفیت کی دلیل ہے، یہ ایسا ہی تصور ہے جیسا کہ جاحظ نے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ عربوں کے علاوہ اقوام عالم میں خطبا نہیں ہوتے، حتیٰ کہ یونان کے بارے میں لکھ دیا کہ وہ خطابت سے واقف تو ہیں مگر اُن کے یہاں خطیب کوئی نہیں ہے[53]، معانی کی تولید انسانی ذہن میں ہوتی ہے، ان کو محدود کرنا گویا زندگی کی وسعتوں کو تنگ کر دینا ہے،

ابن مقفع طالب ادب سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کو ادب کے بنیادی اصولوں سے واقفیت

---

[51] الدرۃ الیتیمہ ص ۶۳ - ۶۴۔

[52] ایضاً " ص ۱۵ - ۱۶۔

[53] نقد النثر از اسحاق بن ابراہیم ملاحظہ ہو مقدمہ از قلم طٰہٰ حسین،

حاصل کرنی چاہئے تاکہ وہ جو کچھ کہے وہ اہلِ نظر کی طرح کہے، اور غلطیوں سے مجتنب رہے،

یہ تنقیدی خیالات ابن مقفع کے دور کے لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں، جب کہ نثر کی تنقید کا سرمایہ بھی عربوں کے پاس برائے نام تھا، اسی بنا پر امیر شکیب نے اس کتاب کے تنقیدی افکار کو دوسرے ناقدوں سے بلند و برتر قرار دیا ہے،

سلسلۂ تاریخ ہند

کتاب		صفحے	قیمت
۱- مقدمۂ رقعات عالمگیر	(زیر طبع)	۴۶۲ صفحے	قیمت لعہ/
۲- بزم تیموریہ	" "	۴۷۸ "	" لعہ/ ۲۵/
۳- بزم مملوکیہ		۳۲۴ "	" معہ/
۴- بزم صوفیہ	"	۵۳۸ "	" عہ ۲۵/
۵- ہندستان کے عہد وسطی کی ایک ایک جھلک		۵۲۴ "	" عہ ۲۵/
۶- مختصر تاریخ ہند		۲۰۸ "	" للعہ/
۷- ہندوستان کی کہانی		۸۰ "	" عار/
۸- تاریخ سندھ	" "	۴۰۸ "	" ہے/
۹- ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام		۴۹۲ "	" عہ/
۱۰- ہندوستان عربوں کی نظر میں	حصہ اول	۴۰۰ "	" ہے/
۱۱- " " "	حصہ دوم	۴۰۱ "	" ہے/

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

جنوب مشرقی ایشیا کے مسلم ممالک

از ڈاکٹر چارلس کالا گھر

مترجمہ

جناب وارث رشید صاحب قدوائی

جنوب مشرقی ایشیا کے وسیع خطہ میں انڈونیشیا اور ملیشیا تقریباً پورے کے پورے اور تھائی لینڈ، فلیپائن، اور سنگاپور کے کچھ علاقے اسلام کے زیر سایہ ہیں، جہاں تقریباً نو کروڑ بندگانِ خدا کے دل اسلام کے نور سے منور ہیں، (یہ تعداد ۱۱ کروڑ سے زائد ہے۔ مترجم) اس خطۂ زمین پر اسلام کی اشاعت کی تاریخ چودھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے، اسلامی مراکز سے بہت دور سات سمندر پار کے اس علاقہ میں اسلام کی تبلیغ صوفیوں اور برگزیدہ درویشوں کے مبارک ہاتھوں ہوئی، یہی وجہ ہے کہ اس خطہ میں تبلیغِ اسلام کی پوری تاریخ میں تشدد کی کہیں مثال نہیں ملتی،

اسلام کے اس دور دراز مشرقی علاقے میں یہ عجیب و غریب صورت نظر آتی ہے کہ جہاں بعض دینی امور میں شدت ہے، وہیں قدیم ہندوانہ اور مشرکانہ اعتقادات و رسوم کو بھی قائم رکھا گیا ہے، (مثلاً وہاں کے لوگ رام، سیتا، اور دوسرے ہندو اور بدھ بزرگوں کے اسماء پر اپنے نام رکھتے ہیں، ہر سال رام لیلا بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہے، رقص جو غیر اسلامی چیز ہے انڈونیشیا کی سماجی زندگی کا جزو ہے، شادی بیاہ کی رسمیں ہندو رسموں سے مختلف نہیں ہیں، اسی

قبیل کی اور چیزیں بھی ان میں رائج ہیں،

جنوب مشرقی ایشیا کی سیاسی، سماجی و اقتصادی صورت حال کے جائزہ میں یہاں کی چینی اقلیت جس کی تعداد ایک کروڑ ہے، ایک اہم عنصر ہے، یہ تعلیم اور دولت کے اعتبار سے بڑی ترقی یافتہ اور با اثر اقلیت ہے، اس کو چین کی پوری امداد بھی حاصل ہے، ملائشیا میں چینی اقلیت جس طرح ملکی سیاست اور مذہب پر اثر انداز ہوتی ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ اسی اقلیت کی بنا پر ملائشیا کو ایک بین الریاستی وفاق کی شکل دی گئی، جہاں پر ملائشیائی اپنے مذہبی اور شرعی معاملات میں مرکزی حکومت کی بجائے ریاستی حکومت کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں، مرکزی حکومت میں وزارت امور مذہبی قائم نہیں کیجا سکی، جب کہ دستوری طور پر اسلام کو ریاست کا مذہب مانا گیا ہے (مذہبی وزارت اب قائم ہو چکی ہے) دونوں قوموں کی فرقہ وارانہ منافرت میں بڑی شدت آگئی ہے (کوالالمپور میں ہونیوالے نسلی فسادات اس منافرت کا واضح ثبوت ہیں مترجم) اس کے علاوہ چینی اقلیت کا تعاون متحدہ محاذ کو حاصل ہے، جو اعتدال پسندوں کی جماعت ہے، اور پین ملائن اسلامک پارٹی کو جس کا نصب العین خالص اسلامی حکومت کا قیام ہے، اس متحدہ محاذ کا سخت مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے،

۱۹۶۳-۶۵ء میں جب ملائشیا اور سنگاپور کے وفاق کی تشکیل عمل میں آئی، تو سارواک اور صباح کی مسلم آبادی کے برطانوی علاقے بھی اس میں شامل کر دیئے گئے، جس کا مقصد یہ تھا، کہ چینی اقلیت کا زور کم کیا جا سکے، ۱۹۶۵ء میں سنگاپور کے وفاق سے الگ ہو کر ریاست بن جانا اس کا واضح ثبوت ہے کہ دونوں عناصر میں کس قدر ذہنی بعد ہے۔

انڈونیشیا ۱۹۴۵ء میں آزاد ہوا، اور اس وقت سے اب تک مختلف قسم کے سیاسی و اقتصادی مسائل سے دوچار ہے، ملائشیائی وفاق میں مسلمانوں پر قانون شریعت نافذ ہے اور سرکاری طور پر ریاست کا مذہب اسلام ہے، چنانچہ دستور کے حصہ دوم دفعہ دوم میں

اس کی بھی تصریح ہے، کہ "حکومت کو قانون کے ذریعہ مسلمانوں میں دوسرے مذہبوں کے عقائد کی تبلیغ و اشاعت کو محدود یا مسدود کرنے کا اختیار حاصل ہوگا" ملائی مسلمانوں کی اقتصادی پس ماندگی کے پیش نظر ان کو دستور میں خصوصی مراعات مثلاً ملازمتوں میں تحفظ اور زمینوں کے مالکانہ حقوق میں مراعات دی گئی ہیں، اور سنگاپور کی آزاد سیکولر حکومت نے بھی ۱۵ فیصدی مسلم آبادی کو یہ مراعات دے رکھی ہیں، اس کے مقابلہ میں انڈونیشیا میں تاریخی وجوہ کی بنا پر انڈونیشی مسلمانوں کو کوئی خصوصی امتیاز حاصل نہیں ہے، جزیرہ جاوا کی مسلم آبادی پر قدیم ہندو اور بدھ دور کے ثقافتی اثرات بہت گہرے ہیں، ان کے عقائد اور رسم و رواج میں سری وجے، سلیندرا اور ماجاپاہت تہذیبوں کے نقوش بہت واضح ہیں، جزیرہ بالی میں ہندو اور دوسرے علاقوں میں عیسائی اپنی تہذیبوں کے ساتھ موجود ہیں، چینی نژاد آبادی اگرچہ ۵ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے لیکن اقتصادی طور پر بہت مضبوط ہے، انڈونیشیائی نیشنلزم کی تاریخ اس صدی کے آغاز میں "سارے کات اسلام" (۱۹۱۲ء) کی تحریک کے ساتھ شروع ہوتی ہے، جو بڑی حد تک مذہب کے ساتھ ہم آہنگ ہے، لیکن ۱۹۲۰-۳۰ء کے دوران سوکارنو اور ڈاکٹر محمد حطی کی قیادت میں سیکلر رجحانات ابھرے جو روز بروز قومی ترقی کرتے گئے، یہاں تک کہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر جب انڈونیشیا کو سیاسی آزادی حاصل ہوئی تو "پنج شیل" کے اصول کو دستوری طور پر قومی پالیسی تسلیم کیا گیا، جس میں خدا پر عقیدہ کا اظہار کیا گیا ہے، مگر اسلام کا ذکر نہیں ہے،

ملائشیا کے سیاسی مذہبی اور سماجی رجحانات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ سماجی طاقتیں جو ملائشیا میں علیحدہ مذہب اور زبان کا نعرہ بلند کر رہی ہیں، سیاست میں پیش پیش ہیں، اور قومی زبان کے معاملہ میں جن جذبات کا اظہار کیا جا رہا ہے، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب اسلام

کی قوت کو نظر انداز کر کے زبان کا سہارا لیا جا رہا ہے، گو اب انڈونیشیا کا رویہ مذہبی اعتدال پسندی کا ہے لیکن احیائے مذہب کی تحریکوں کے قومی اثرات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا "دار الاسلام" کی گوریلا تحریک (۱۹۴۰ء) مسجومی پارٹی کے ساتھ سوکارنو کی مفاہمت اور ۱۹۶۵ء کی ناکام بغاوت کے بعد کمیونسٹوں کے خلاف تشدد کی مہم، یہ سب باتیں اسلام کے قومی اثرات کی نشاندہی کرتی ہیں، ملائشیا اور انڈونیشیا کے طرز فکر میں فرق یہ ہے کہ ملائشیا میں سیاسی معاملات میں بھی مذہب کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اور انفرادی زندگی کے تانے بانے بھی مذہب کی قدروں سے بنے جاتے ہیں، اور انڈونیشیا میں مذہب کو سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا گیا ہے،

چینی اقلیت کے معاملہ میں انڈونیشیا اور ملائشیا کی حکومتوں کے طرزِ فکر میں نمایاں اختلاف رہا ہے ان دونوں کے نظریاتی اختلافات اور باہمی مخاصمت جنوب مشرق ایشیا کے اہم مسائل رہے ہیں، اور اب بھی ہیں، ان اختلافات کا اظہار ۶۶-۱۹۶۳ء کی کشمکش کی صورت میں ہو چکا ہے، جب دونوں جنگ کے دروازہ تک پہونچ گئے تھے، اب یہ آگ ٹھنڈی پڑ چکی ہے، اور فلپائن کے ساتھ دونوں ملکوں کی مشترک تہذیبی اقدار کے پیش نظر تینوں ممالک کی ایک مشترکہ یونین "مافلینڈو" کے قیام کی تجاویز بھی پیش ہوئی تھیں، اور اب یہ توقع پیدا ہو گئی ہے، کہ شاید "نوسانتارا" یعنی ہندوستان اور چین کے درمیان ایک وسطی علاقہ کا قدیم تصور پھر اپنا مقام حاصل کرلے لیکن سوال یہ ہے کہ اس اشتراک کی بنیاد کیا ہو سکتی ہے، ؟ بلا شبہہ ملائشیا کو انڈونیشیا کے لسانی اور ثقافتی خزانہ سے بہت کچھ مل سکتا ہے لیکن ملائشیا کے گہرے مذہبی رجحانات اور انڈونیشیا کی نام نہاد سیکلرزم کے درمیان مفاہمت کی شکل کیسے پیدا ہو سکتی ہے، ؟

انڈونیشیا میں اکتوبر کے انقلاب کے بعد کمیونسٹ چین اور چینی اقلیت کے خلاف بڑی شدت

سے جذبات ابھر آئے ہیں، ملائشیا میں فرقہ وارانہ جذبات پہلے ہی سے عروج پر ہیں، دونوں میں مذہبی انتہا پسندوں اور انتہا قوم پروروں کے درمیان مفاہمت کی کوششیں جاری تھیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نفرت اور تشدد کا لاوا کب پھر پھوٹ نکلے، انڈونیشیا میں آباد چینیوں کیلئے تو چین نے اپنے ملک میں واپس آنے کی پیشکش بھی کی تھی،

انڈونیشیا اور ملائشیا کی چینی اقلیت کی مخالفت کے اسباب مختصراً یہ ہیں، اولاً یہ غیر ملکی اور غیر نسل کے ہیں، جو ملکی ثقافت اور معاشرہ سے الگ اپنی وحدت کو برقرار رکھتے ہیں دوسرے اقتصادیات پر مکمل طور پر چھائے ہوئے ہیں، تیسرے ان پر بین الاقوامی اشتراکیت کے گہرے اثرات ہیں، چوتھے یہ ملحد ہیں، اس لئے اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان ملکوں کے موجودہ ارباب اقتدار فرقہ وارانہ انتہا پسندی کے بارے میں کوئی معقول اور منصفانہ رویہ اختیار کرنے کے اہل ہیں؟ یا ان عناصر کو من مانی کرنے کا موقع مل جائے گا،

حال ہی میں بورنیو ملائی حصے کے جنگلات میں روپوش چینی گوریلا دستوں کے لئے کچھ اشتہارات ملائی حکومت کی طرف سے پھینکے گئے تھے، جن میں ٹنکو عبد الرحمن کی طرف سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر یہ دستے ہتھیار ڈال دیں، تو ان کو معاف کر دیا جائے گا، اور بحفاظت ملک سے باہر جانے کی بھی اجازت دیدی جائے گی، ان گوریلا دستوں کی تشددانہ اور تخریبی کارروائیاں اگرچہ بہت حد تک کم ہو گئی ہیں لیکن ختم نہیں ہوئی ہیں، اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ٹنکو عبد الرحمن کے ذہن میں وہ کونسی جگہ ہے جہاں ان باغی چینیوں کو بھیجا جا سکتا ہے، ؟ وہ جگہ چین یا سنگاپور ہی ہو سکتی ہے؛ ان اشتہارات میں سنگاپور کے وزیر اعظم لی۔ کوان۔ ایو کے اس بیان کو بھی نشر کیا گیا تھا کہ ریاست سنگاپور تمام چینی نژاد لوگوں کی آخری پناہ گاہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ٹنکو کے ذہن میں سنگاپور ہی رہا ہوگا،

(مسلم ورلڈ)

مطبوعات جدیدہ

کتاب الاموال حصہ اول و دوم مترجمہ جناب عبدالرحمٰن طاہر سورتی صاحب تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات بالترتیب ۵۴۳ و ۴۰۰، مجلد مع گرد پوش قیمت ۱۵ و ۱۳ پتہ:۔ ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد (پاکستان)

امام ابو عبید قاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ) جامع کمالات اکابر علمائے اسلام میں تھے، اُن کی تصنیفات میں کتاب الاموال بہت اہم اور مشہور ہے، اسلام کے مالیاتی امور و مسائل پر قدما کی جو چند کتابیں زیادہ مہتم بالشان اور مستند سمجھی جاتی ہیں، اُن میں ایک یہ بھی ہے، اس میں ان اموال کا ذکر ہے، جو اسلامی حکومت (بیت المال) کی تحویل میں ہوتے ہیں، اس کے متعدد اجزاء ہیں، زیر نظر کتاب اس کا اردو ترجمہ اور دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں ان آمدنیوں کا ذکر ہے، جو اسلامی حکومتوں کو مفتوحہ علاقوں اور غیر مسلموں سے حاصل ہوتی ہیں، جیسے فئے، غنیمت اور جزیہ وخراج وغیرہ، اُن کی مختلف صورتیں اور سب کے احکام غنیمت اور فئے کے مصارف، اُن کا فرق، جزیہ وخراج کی وصولی کے قاعدے، زمینوں کے احکام تقسیم اراضی، جاگیرداری، فوجی قوت اور صلح سے فتح کئے جانے والے علاقوں کے قوانین، امن و صلح اور عہد شکنی کی صورتوں، اور اُن کے احکام، شرائط صلح، اہل کتاب و مشرکین، اور مشرکین عرب و عجم کا فرق، اور اُن کے احکام ذمیوں کے مسائل وحقوق اور امام و رعایا کے باہمی حقوق اور ذمہ داریوں وغیرہ پر مفصل اور محققانہ بحثیں ہیں، اور دوسرے حصہ میں مسلمانوں سے ملنے والی اسلامی حکومت کی آمدنی یعنی صدقہ و زکوٰۃ کا ذکر ہے، اس میں زکوٰۃ کی فرضیت، اہمیت، فضیلت، مختلف قسم کے

اموال مثلاً مختلف مویشیوں، اور جانوروں، سونے چاندی کے زیورات اور سکوں، زرعی پیداوار، درختوں کے پھلوں کی زکوٰۃ کے احکام و مسائل محصلین زکوٰۃ کے ضابطے، مختلف پیمانوں اور اوزان کی تحقیق اور زکوٰۃ کے مصارف و مدات وغیرہ تمام مباحث آگئے ہیں، ان مسائل کے ضمن میں ابو عبید نے اسلام کے تقریباً دو سو سالہ عہد کے مالیاتی نظام کے واقعات، رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدینؓ کے فرامین اور تعامل نیز ائمۂ اسلام اور فقہائے امصار کے اقوال وغیرہ بھی تحریر کئے ہیں، اور مختلف اقوال میں محاکمہ اور اپنے اجتہادات و اختیارات بھی بیان کئے ہیں، اس حیثیت سے یہ کتاب مالیات کے متعلق احادیث و آثار اور فقہی اقوال و احکام دونوں کا جامع ذخیرہ، اسلام کے مالیاتی نظام کی ایک مستند دستاویز اور مالیات کے متعلق مختلف النوع معلومات کا ایک وسیع دفتر ہے، جناب عبدالرحمٰن طاہر سورتی نے جو علامہ محمد سورتی مرحوم کے لائق فرزند ہیں، اس پر از معلومات اور ضخیم کتاب کا اردو ترجمہ شائع کرکے ایک مفید دینی خدمت اور موجودہ زمانہ کی ایک اہم ضرورت پوری کی ہے، پہلی جلد میں انھوں نے امام ابو عبید کے حالات اور کارنامے بھی بیان کئے ہیں، اور ہر جلد کے شروع میں ان کا فاضلانہ مقدمہ بھی ہے، اس میں دونوں حصوں کے مضامین و محتویات کی وضاحت اور کتاب الاموال کا تعارف کرایا گیا ہے،

العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین مرتبہ مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ، طباعت خوشنما ٹائپ، صفحات ۳۳۶، قیمت درج نہیں، پتہ (۱) خالد کمال و ظفر مسعود، مبارک پور، اعظم گڈھ، (۲) ابناء مولوی محمد بن غلام رسول سورتی تاجران کتب جامع محلہ بمبئی نمبر ۳،

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے عرب و ہند خصوصاً اُن کے ابتدائی اسلامی عہد کے تعلقات

پر اُردو اور عربی میں کئی کتابیں لکھی ہیں، یہ عربی کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاے راشدینؓ اور بنی امیہ کے زمانہ میں دونوں ملکوں کے تعلقات اور خلافت راشدہ اور اموی دور میں ہندوستان کی سرحدوں اور بعض علاقوں میں مسلمانوں کی فتوحات کا تذکرہ اور غزوات و فتوحات یا دعوت و تبلیغ وغیرہ کی غرض سے یہاں آنے والے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے تراجم قلمبند کئے گئے ہیں، اور آخر کے ایک باب میں اُس زمانہ کے مشہور ہندوستانی علماً و محدثین کا اجمالی تذکرہ بھی ہے، عرب و ہند کے متعلق قاضی صاحب کی تصنیفات میر انیس مرحوم کے اس مصرع کا

ع :- "اک پھول کا مضمون ہو تو سو طرح سے باندھوں"

بالکل نمونہ ہیں، لیکن موضوع کی یکسانیت نے اُن کی ہر کتاب میں تکرار پیدا کر دی ہے، چنانچہ اس کتاب میں بھی دوسری کتابوں کے اکثر محتویات آگئے ہیں، اور حشو و زوائد سے بھی خالی نہیں، تاہم کتاب محنت سے لکھی گئی، اور پر از معلومات ہے، اس سے مسلمانوں کے ہندوستان پر ابتدائی حملے اور قبضے کی روداد، اور قرن اول اور قرن ثانی کے ان مجاہدین، امراء، عساکر، حکام و والیان ریاست کے جو یہاں آئے، اور مختلف مناصب پر فائز ہوئے، یا داعیوں اور مصلحوں یا جن کا کسی نوع کا بھی یہاں سے تعلق رہا ہے، کے حالات وغیرہ معلوم ہوتے ہیں، یہ کتاب عرب و ہند کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے، زبان و بیان دلکش اور سلیس ہے،

فن اسماء الرجال مرتبہ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت طباعت عمدہ، صفحات ۱۱۰، قیمت ایک روپیہ ۵، پیسے، پتے :- (۱) مکتبہ فلاح دارین ترکیسر ضلع سورت، گجرات (۲) مکتبہ الفرقان کچہری روڈ، لکھنو، یو۔پی،

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کو درس و تدریس کی طرح تصنیف و تالیف کا بھی اچھا ذوق ہے،

کئی سال سے وہ حدیث کی تعلیم کی خدمت انجام دینے کے علاوہ وقتاً فوقتاً اُس کے متعلق مفید مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں، جن کا ایک مجموعہ "محدثین عظام" کے نام سے پہلے شائع ہو چکا ہے، اور اب یہ نیا مجموعہ شائع کیا گیا ہے، اس میں رواۃ حدیث کی تحقیق و تفتیش اور روایات کے صحت و انضباط کے متعلق محدثین کے کارناموں اور بے نظیر خدمات کا ذکر، فن اسماء الرجال کی اہمیت اور جرح و تعدیل کے اصول و ضوابط تحریر کئے گئے ہیں، اردو میں اس موضوع پر ضمناً بہت لکھا گیا ہے، سیرۃ النبی حصہ اول اور خطبات مدراس میں بھی اس پر سیر حاصل بحث ہے، لیکن کوئی مستقل کتاب موجود نہیں تھی، اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو گئی، صفحہ ۱۶ پر جامع ترمذی کے حوالے سے حضرت عمرؓ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے، اس میں تین غلطیاں ہو گئی ہیں، ترمذی نے لا نترک کے بجائے لا ندع، سنۃ نبیہ، کے بجائے، سنۃ نبینا" اور "او" کی جگہ "ام" نقل کیا ہے، البتہ امام مسلم نے لا ندع، اور "او" کی اور امام دارمی اور دارقطنی نے "سنۃ نبیہ" کی روایت کی ہے، ص ۱۷ پر کذب بمعنی اخطار کو علماے امت کا متفقہ قول قرار دیا گیا ہے، حالانکہ حضرت عمرؓ کا قول خود اس اجماع کا ناقض ہے، اور مصنف نے ابن حجر اور خطیب کے جو بیانات اس کی تائید میں نقل کئے ہیں، ان کوئی ثبوت نہیں مہیا ہوتا، ص ۳۷ پر ہے کہ خوارج و روافض کے ظہور کے بعد روایات تحقیق و تفتیش کے بعد قبول کی جاتی تھیں، اور اس کے ثبوت میں حاکم کا ایک قول نقل کیا گیا ہے، جس سے اس کے بجائے شیخین (ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما) ہی کے زمانہ سے تحقیق روایات کا پتہ چلتا ہے، ص ۹۱ پر محمد بن طاہر کا نام محمد طاہر لکھا گیا ہے، جو غلط ہے، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر یہ کتاب مستند اور خصوصیت سے عربی خواں طبقہ اور طلبۂ حدیث کے مطالعہ کے لائق ہے، مصنف نے اسماء الرجال کے متعلق اکثر معتبر عربی کتابوں کا نچوڑ اس میں نہایت سلیقہ سے جمع کر دیا ہے،

بھوپال اور غالب :- مرتبہ جناب عبد القوی دسنوی صاحب تقطیع خورد، کاغذ،

کتابت، و طباعت بہتر، صفحات :- ۱۲۸، قیمت :- ۶ روپیے، پتہ :

شعبۂ اردو، سیفیہ کالج بھوپال،

مرزا غالبؔ مرحوم اگرچہ بھوپال نہیں جا سکے تھے، لیکن اس سے ان کا کئی حیثیتوں سے تعلق رہا ہے، اردو کے متعارف اہلِ قلم جناب عبدالقوی دسنوی نے اس کتابچہ میں اُن کے ان تعلقات کا ذکر، اور اُن کے گیارہ شاگردوں کے جن کا بھوپال سے کسی قسم کا تعلق رہا، حالات مختصر لکھے ہیں، اور غالبؔ کے دو ملاقاتیوں نواب صدیق حسن خاں اور امجد علی اشہری کا بھی ذکر کیا ہے، آخر میں بھوپال کی ایک شاعرہ اور ایک شاعر کے غالبؔ کی غزل پر خمسے، شنکر پرشاد جوش بھوپالی کا ایک معترضانہ مضمون نمونۂ مغلوبیت غالب نسخہ حمیدیہ، اور سہا صاحب بھوپالی کی شرح، دیوانِ غالب، مطالبِ الغالب کا بھی اجمالی ذکر ہے، اس حیثیت سے یہ نہایت دلچسپ اور غالبیات کے متعلق انوکھے طرز کا کتابچہ ہے،

غزل انسائیکلوپیڈیا، مرتبہ جناب ذکی کاکوری صاحب ایم اے، علیگ تقطیع خورد کاغذ، طباعت و کتابت بہتر، صفحات ۳۰۴، قیمت :- صر ؏
پتہ :- مرکز ادب اردو ۱۳۷ - شاہ گنج، لکھنؤ،

غزل اردو کی سب سے مقبول صنفِ سخن ہے، اس لئے ہر زمانہ میں اس کے انتخابات مرتب کئے گئے ہیں، یہ نیا انتخاب اردو کے ایک نوجوان اور خوش ذوق شاعر نے کیا ہے، گو اس کو جامع اور مکمل نہیں کہا جا سکتا، تاہم مرتب نے شروع سے لے کر اب تک کی غزلیہ شاعری کے نمونے اس میں جمع کر دیئے ہیں، اور مختصر ہونے کی وجہ سے ہر شخص کے لئے اس کا مطالعہ آسان بھی ہے،

" ض "